ایں عمرِ دراز صرفِ عصیاں بودہ
باایں ہمہ اعوجاج بخشش خواہی
یکبار ترا نہ چشمِ گریاں بودہ
گرنیست عمل بیا پشیماں بودہ

اثرِ نالۂ دردم بچمن باقی باد!
گرچہ ایں نغمۂ آزادی تو نیز خوش است
حیف گر نالۂ من یادِ نگیری بلبل
لیک خوشتر بود آہنگِ اسیری بلبل

باور مکن قولِ عدو ساغر کجا و شیشہ کو
من میدوم سوئے حرم دل می کشد سوئے صنم
اے محتسب ایں ہائے و ہو دارم زصہبائے دگر
من میروم جائے دگر دل می برد جائے دگر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

منائیں گے دلِ بیمار کو جفا کے لیے — وفا تو اب کہیں ملتی نہیں دوا کے لیے

گلہ کیا تو کس انداز سے بگڑ کے کہا — کہ تم نے رنج سہے اپنے مدعا کے لیے

یار کیا ذات ہے تیری کہ ندیدہ ہو کر
ان کے ملنے کی ہوس کی تو یہ بولے انوز
مجھ کو دیدہ نظر آتا ہے شنیدہ ہو کر
رہرو عشق کی یہ شان جریدہ ہو کر

اردو فارسی شعر:

پروانہ ام کہ کارِ من از حد گزشتہ است
سوزم من از دلِ خود و پروانہ از چراغ
در اختیارِ خویش نہ در اختیارِ شمع
من داغدارِ خویشتم و داغدارِ شمع

(مآثر صدیقی - فقہائے ہند - اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جلد ۲! ،
ماہنامہ فاران" کراچی جون ۱۹۷۱ء)

اے عشق بے پروا بیا تا داریم از ما سوا | جز درد تو نبود مرا در دل تمنائے دگر
شاہجہانم بیگماں ہم تاجور در ہندیاں | جز یادِ دادر در جناں دارم نہ سودائے دگر

"باغ دلکشا" کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں:

دلکشا باغ لطیف و خوب است | فرحت افزا چوں رُخ محبوب ست
ثمرش قوتِ دلہائے ضعیف | گلِ او تازگیٔ جانِ نحیف
انبہ اش کوزۂ شہد ست و نبات | شیرہ اش صاف تر از آبِ حیات
بوئے او راحتِ جانِ شیدا | رنگِ عشاق ز بویش پیدا

اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا | مشہور اسی نے کیا یہ نام ہمارا
پیدا ہوئے ہم اُمّتِ محبوبِ خدا میں | برتر نہ ہو کیوں رتبۂ اسلام ہمارا
آتی ہے ہوا سر دگھٹا اٹھتی ہے گھنگور | منگواؤ مُصراحیٔ مے و جام ہمارا
بتیابیٔ دل اس کے بھی دل میں تو اثر کر | مدت سے یہی تجھ سے ہے پیغام ہمارا
اے بادِ صبا تو ہی تنِ زار کو لے چل | گلزار میں آیا ہے وہ گلفام ہمارا
ہم کرتے ہیں حج کوچۂ دلدار کا اپنے | ہے چادرِ تن جامۂ احرام ہمارا
فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے | کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا
پہلی سی کا دٹ نہیں اب ہے نظرِ لطف | آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا
کافر کیا مجھ کو تری اس زلف نے کافر | اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر شکنی کا!
شیریںؔ جو تخلص میں ہوا نام ہمارا

نواب باقی محمد خان مرحوم کی صُلب سے نواب شاہ جہاں بیگم کی دو بیٹیاں

پیدا ہوئی تھیں، سلیمان جہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم۔ سلیمان جہاں بیگم صغر سنی میں فوت ہوگئیں البتہ سلطان جہاں بیگم، والدہ کے عقدِ ثانی کے وقت جوان تھیں۔ بدقسمتی سے ماں بیٹی کے تعلقات سخت کشیدہ ہوگئے۔ اس کے کئی اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ تھا کہ نواب شاہجہان بیگم کو شبہ تھا کہ سلطان جہاں بیگم نے اپنے سوتیلے باپ (نواب صدیق حسن خان) کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا ہے۔ جس کی بناء پر نواب صاحب پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ چنانچہ وہ بیٹی سے ایسی ناراض ہوئیں کہ ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھیں۔ بول چال ملنا جلنا سب ترک ہوگیا تھا۔ بیٹی نے ماں کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن ان کے دل میں کچھ ایسی گرہ بندھی تھی کہ مرتے دم تک نہ کھل سکی۔

نواب شاہ جہاں بیگم نے ریاست کی آبادی کے لیے بہت کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے شہر بھوپال کے باہر شاہ جہاں آباد تعمیر کرایا جس پر بیس لاکھ روپے صرف ہوئے ــــــ نواب شاہ جہاں بیگم کے دوسرے شوہر نواب صدیق حسن خان نے ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔ اس کے گیارہ سال بعد ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۱ء میں نواب شاہجہان بیگم نے پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ نواب صدیق حسن خانؒ نے اپنی کتاب "تذکرہ شمع انجمن" مرتب کی تو اس میں نواب شاہجہان بیگم کے بارے میں یہ عبارت لکھی:

"نواب شاہجہان بیگم نے اہلِ علم و فضل اور اصحابِ ہنر و کمال کی تربیت پر جس ہمتِ خداداد سے توجہ مبذول فرمائی اس کی نظیر خواتینِ ہند میں زیب النساء بیگم دخترِ عالمگیرِ اعظم کے سوا کہیں نہیں ملتی۔"

یہ عبارت انہوں نے اس لیے نہیں لکھی کہ نواب شاہجہان بیگم ان کی اہلیہ تھیں بلکہ فی الحقیقت نواب شاہ جہان بیگم نے معارف پروری اور اربابِ فضل و کمال کی قدر دانی میں خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے۔

(مشاہیرِ نسواں۔ تاریخِ لودی۔ فاران کراچی جون ۱۹۷۱ء۔ بیگماتِ بھوپال)

زکیہ بیگم

یہ خاتون منشی جمال الدین خاں بہادر[1] کی صاحبزادی تھیں جو نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کے زمانے میں ریاست بھوپال کے مدار المہام (وزیر اعظم) تھے۔ فاضل والد نے ان کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام سے کی۔ قرآن کریم خود ان کو ترجمہ کے ساتھ پڑھایا، ساتھ ہی فارسی اور اردو کی تعلیم بھی دی۔ وہ بڑی راسخ العقیدہ، موحّد، نرم دل اور فیاض خاتون تھیں۔ پردہ اور نماز کی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تصنیفات مراۃ العروس اور بنات النعش بڑے شوق سے پڑھیں اور عمر بھر ان کو پسند کرتی رہیں۔ اردو کے علاوہ فارسی

---

[1] منشی جمال الدین خاں کہنے کو تو ایک بڑی ریاست کے مدار المہام تھے لیکن فی الحقیقت اسلاف کی یادگار اور صلحائے اُمّت کا نمونہ تھے۔ ۱۲۱۷ھ ہجری میں کوٹانہ مضافاتِ دہلی کے ایک شریف علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے۔ عربی اور فارسی کی ضروری تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی پھر دہلی جا کر حضرت شاہ محمد اسحاق محدثؒ کے سامنے زانوئے تلمّذ تہہ کیا اور ان سے حدیث کی سند لی۔ ان کے علاوہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، مولانا مملوک علیؒ، شاہ غلام علیؒ اور مولانا محمد آفاق نقشبندیؒ سے بھی کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد تلاشِ معاش میں بھوپال پہنچے۔ پہلی مرتبہ حصولِ ملازمت میں کامیابی نہ ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آئے۔ اس مرتبہ ایک دفتر میں معمولی سی اسامی پر تقرر ہو گیا۔ بڑے ذہین اور مستعد آدمی تھے ترقی کرتے کرتے افسر بن گئے پھر افسری سے بھی درجہ بدرجہ ترقی کر کے نائب وزیر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اس وقت نواب سکندر بیگم والیۂ ریاست

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بھی خاصی استعداد تھی۔ "گلستان" کی اکثر ضرب الامثال ان کو زبانی یاد تھیں۔ "بوستان" کے بہت سے اشعار بھی نوکِ زبان تھے۔ مال و دولت، حسب و نسب، علم و فراست، حسن و جمال اور دینداری یہ سب خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ان میں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

تھیں۔ انہیں کئی موقعوں پر منشی صاحب کی فراست اور قابلیت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ خالی ہوا تو انہوں نے منشی صاحب کو بھوپال کا وزیرِ اعظم (مدار المہام) مقرر کر دیا۔ اس وقت معاشی اعتبار سے ریاست کی حالت نہایت ابتر تھی۔ منشی صاحب نے کاروبارِ حکومت ایسی خوش اسلوبی سے چلایا کہ ریاست کی آمدنی پندرہ لاکھ سے بڑھتے بڑھتے ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی اور انگریزی حکومت نے اسے درجۂ اوّل کی ریاست قرار دیا۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے "فقہائے پاک ہند" میں لکھا ہے کہ نواب سکندر بیگم نے ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں ان سے نکاحِ ثانی کر لیا۔

منشی جمال الدین خاں نہایت دیندار، مخیّر اور معارف پرور بزرگ تھے۔ انہوں نے نواب سکندر بیگم کی تائید و تعاون سے اشاعتِ تعلیم کے لیے بے پناہ کام کیا۔ سب سے پہلے منشی صاحب نے اپنے ذاتی صَرف سے ایک عالی شان مسجد اور دینی مدرسہ تعمیر کرایا اس میں مفت قیام و طعام کے علاوہ طلبہ کو کتابیں اور وظائف بھی دیئے جاتے تھے۔ تعلیم دینے پر نامور علماء مامور تھے، جن کو معقول مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ اس مسجد کے علاوہ بعد میں انہوں نے ریاست میں کئی اور مسجدیں اور مدرسے بھی بنوائے۔ نواب سکندر بیگم نے بھی ایک عظیم الشان مسجد اور دینی درسگاہ تعمیر کرائی۔ امراء اور جاگیرداروں نے ان کی پیروی کی، اس طرح دینی تعلیم کو بحید فروغ حاصل ہوا۔

منشی جمال الدین خاں یوں تو وزیرِ اعظم تھے اور بڑے اختیارات کے مالک تھے لیکن ان کی ذاتی زندگی بالکل درویشانہ تھی۔ وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی انہوں نے ایوانِ وزارت سے قیمتی اور پُر تکلف ساز و سامان اٹھوا دیا اور اس کی جگہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جمع کر دی تھیں۔ جنگِ آزادی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء سے پہلے اپنے والد کے ساتھ حجاز گئیں اور حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ ان کی شادی ایک شریف اور معزز گھرانے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

سادہ فرش بچھوا دیا جس پر گاؤ تکیے رکھوا دیئے گئے تاکہ وزیرِ اعظم اور عام حاضرین میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔ لباس اتنا سادہ ہوتا تھا کہ کوئی اجنبی ان کو دیکھ کر باور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ریاست کے وزیرِ اعظم ہیں۔ ململ کا کرتا، معمولی انگرکھا اور شرعی پاجامہ زیبِ تن ہوتا تھا سر پر ہمیشہ ململ کا صافہ ہوتا تھا۔ کسی تقریب کے موقع پر والیۂ ریاست کی طرف سے قیمتی کپڑے تحفہ میں ملتے تو ان کپڑوں کو غریبوں میں بانٹ دیتے تھے۔ نماز با جماعت کا بے حد التزام تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے مسجد میں دیر ہو جاتی اور جماعت ہو چکی ہوتی تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھ کر مسجد سے باہر آجاتے، وضو کرنے میں جو آستینیں چڑھائی جاتی تھیں اسی طرح کہنیوں تک چڑھی ہوتی ہیں۔ دوسری مسجد میں جا کر پوچھا، جماعت ہو گئی ہے؟ جواب ملا، جی ہاں۔ اسی طرح ہر مسجد میں پوچھتے ہوئے پیدل شہر کے آخر تک چلے جاتے کہیں نہ کہیں نماز با جماعت مل جاتی اور وہ اطمینان کا سانس لیتے۔ اس دوران میں بگھی اور اردلی کے سوار ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ محل کے قریب مسجد میں نماز پڑھا کرتے تھے، وہاں کبھی کبھی نمازِ جمعہ سے قبل وعظ بھی کہتے تھے۔

ایک دن منبر پر کھڑے ہوئے اور یوں آغازِ کلام کیا :-

"صاحبو آپ ہمیں جانتے ہیں ہم اس ریاست کے وزیرِ اعظم ہیں اتنی بڑی ہماری تنخواہ ہے اتنی بڑی ہماری جاگیر ہے۔ ہم شاہی محل میں رہتے ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے فوج اور پولیس کے دستے مقرر ہیں۔ ہماری سواری کا یہ اہتمام ہے ہم جسے چاہیں جاگیر دیں اور جس کی جاگیر چاہیں ضبط کر لیں۔ ہمارے یہ اختیارات ہیں وہ اختیارات ہیں۔"

ان کی تقریر سن کر نمازی حیران تھے کہ یہ آج منشی جی کو کیا ہو گیا کیسی متکبرانہ باتیں کر

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یں ہوئی لیکن جوانی ہی میں بیوہ ہو گئیں۔
نواب سید صدیق حسن خاں قنوجی کا بھوپال میں درود ہوا تو منشی جمال الدین خاں ان کے علم و فضل، خاندانی سیادت اور شرافت، دینداری اور حسنِ اخلاق

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

رہے ہیں۔ اب یکایک منشی صاحب یوں گویا ہوئے:

"آپ نے ہمارے جاہ و حشم کا حال سن لیا، اب ہماری اصل حقیقت بھی سن لیجیے۔ آپ جیسے صاحبوں کے ٹکڑوں پر برسوں طالب علمی کرتے رہے۔ پڑھ لکھ کر نوکری کے لیے در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرے مگر کسی نے ہمیں ملازمت کے قابل نہ سمجھا۔ بھوپال میں ایک بیمار اونٹنی پر سوار ہو کر آئے تھے یہاں بھی کسی نے دمڑی کو نہ پوچھا۔ بہت دنوں کے بعد ایک معمولی سی نوکری مل گئی، پھر اللہ نے اس درجے تک پہنچا دیا لیکن بیگم صاحب ذرا ناراض ہو جائیں تو ہمیں ایک پل میں ملازمت سے علیحدہ کر دیں، جاگیر ضبط کر لیں، محل سے نکلوا دیں اور ایک معمول سپاہی ہمیں ریاست کی سرحد سے باہر کر آئے اور ہم وہی جمال الدین رہ جائیں جو پہلے تھے۔ صاحبو! تو یہ حقیقت ہے اس عزت و منصب کی جس پر ہم اتنا اترا رہے تھے اور جسے ایک عورت لمحہ بھر میں چھین سکتی ہے۔ یاد رکھو! اصلی عزت وہ ہے جس کو کبھی زوال نہ ہو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے، اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے خالق و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عزت اور ذلت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔"

نواب سکندر بیگم کے بعد نواب شاہجہان بیگم والیۂ ریاست ہوئیں تو انہوں نے بھی منشی صاحب کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا بلکہ ان کے منصب میں اضافہ کر دیا۔ منشی صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے ۲۵ شعبان ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کو اپنی بیوہ بیٹی زکیہ بیگم کا نکاحِ ثانی ان سے کر دیا۔ دونوں میاں بیوی کے تعلقات نہایت خوشگوار رہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(ان کے زمانۂ ولی عہدی میں) ان کے اتالیق بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ وہ ان کو ماموں میاں کہتی تھیں۔ منشی صاحب نجی زندگی میں قدیم اساتذہ کی طرح نواب شاہجہان بیگم کو ازراہِ محبت تو کہہ کر بھی مخاطب کر لیا کرتے تھے۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم جاری کر دیتیں جو منشی صاحب کے خیال میں مناسب نہ ہوتا تو وزیر ہونے کی حیثیت میں وہ اس کی تعمیل تو کر دیتے لیکن محلِ شاہی میں جاکر بیگم صاحبہ کے سامنے دلائل کے ساتھ اس کا غلط ہونا ثابت کر دیتے۔ ایک بار کسی ایسے ہی موقع پر ایک طویل تقریر کی اور پھر ہنس کر بولے :-

"اے شاہجہان! تجھے کوئی دو کوڑی میں بیچے تو میں مول نہ لوں۔"

انہوں نے ہنس کر جواب دیا ـــ "ماموں میاں اگر کوئی آپ کو دو کروڑ میں بیچے جب بھی میں خرید لوں۔"

علم و فضل کے اعتبار سے منشی صاحب کا پایہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے گرانقدر علمی خدمات انجام دیں۔ قرآن پاک کا پشتو میں ترجمہ کرایا۔ اس کے علاوہ شاہ اسمٰعیل شہید کی کتاب ایضاح الحق کا ترجمہ بیش قرار معاوضہ دے کر کرایا اور اس کی ایک ہزار جلدیں چھپوا کر مفت تقسیم کیں۔ منشی صاحب شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور گمنام تخلص کرتے تھے۔ منشی صاحب بیاسی سال کی عمر پاکر ۲۷ محرم ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) کو راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والے لوگوں کی آمد ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی چنانچہ ان کی نمازِ جنازہ گیارہ مرتبہ پڑھائی گئی۔

صاحب "فقہائے پاک و ہند" کا بیان ہے کہ منشی جمال الدین طلبہ کو خود قرآن و حدیث

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے نواب صاحب کو ایک لڑکی اور دو لڑکے عطا کیے۔ ۲۳ سال کی مثالی رفاقت کے بعد ۱۳۰۱ھ میں وہ اپنے میاں کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ نواب صدیق حسن خاںؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"یہ بڑی خوش نصیب بیوی تھیں جب تک وہ زندہ رہیں کبھی کوئی تشویش پیش نہیں آئی ان کی وفات کے بعد ہی مجھ پر رنج و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔" (مآثرِ صدیقی)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

اور کتبِ فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید خرید کر مستحقین میں تقسیم کرتے۔ قرآنِ کریم کے ترکی و فارسی تراجم و تفاسیر خطیر رقم خرچ کر کے طبع کرائے اور انہیں ترکستان اور افغانستان میں تقسیم کرایا۔

شیخ علی بن احمد صائمیؒ (المتوفی ۸۳۵ھ) کی تفسیر رحمانی چار جلدوں میں اپنے خرچ پر مصر سے شائع کرائی ـــــ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصانیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" مطبع صدیقی بریلی سے طبع کرائیں۔ متعدد دوسری اہم کتابیں بھی اپنے خرچ پر قاہرہ میں چھپوائیں اور مستحقین میں تقسیم کیں۔ انہوں نے "کوکبِ دری" کے نام سے قرآنِ مجید کا فرہنگ بھی لکھا۔

دخترِ حضرت شاہ محمدؐ اسحاق صاحبؒ[1]

یہ خاتون بڑی عالمہ فاضلہ تھیں۔ انہوں نے جملہ دینی علوم اپنے والدِ گرامی سے حاصل کیے تھے اور قرآن حدیث اور فقہ میں درجۂ تبحر حاصل کرلیا تھا۔ ان کی شادی مولانا مفتی عبدالقیوم بودھانوی (بڈھانوی) سے ہوئی تھی جو سیّد احمد شہید بریلوی کے خلیفۂ اوّل مولانا عبدالحی بڈھانوی کے فرزند تھے۔ مولانا عبدالقیوم رحمۃ اللہ علیہ بڑے متبحر عالم تھے۔ اور عوام کے علاوہ خواص میں بھی ان کو بڑی عزّت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۲۷۱ھ ہجری میں نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کی شادی نواب باقی محمدؐ خان سے ہوئی تو نکاح پڑھانے

---

[1] حضرت شاہ محمدؐ اسحاقؒ کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے نامور فقہاء میں ہوتا ہے۔ وہ شیخ محمدؐ افضلؒ کے بیٹے اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ (ابنِ شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ) کے نواسے تھے۔ علمِ حدیث اور فقہ کی تحصیل انہوں نے اپنے گرامی قدر نانا سے کی۔ وہ اپنے بزرگوں کے تمام اوصافِ حمیدہ کے حامل تھے۔ ۱۲۳۹ھ میں شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کے بعد تمام اصحاب نے شاہ محمدؐ اسحاقؒ ہی کو ان کا جانشین مقرر کیا (شاہ عبدالعزیزؒ کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی)۔ انہوں نے کچھ دنوں کے بعد حجاز کا سفر کیا۔ حج کرنے کے بعد واپس آئے اور پھر درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور تبلیغ و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ لیکن ان کا دل ہندوستان سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ چند سال بعد پھر حجاز کا رُخ کیا اور مکہ مکرّمہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ وہیں ۱۲۶۲ھ ہجری میں وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر پینسٹھ برس کی تھی۔

کے لیے مولانا عبدالقیومؒ ہی کو بُلایا گیا تھا۔ والیۂ بھوپال نے ان کے علم و فضل کو دیکھتے ہوئے انہیں ریاست کا مفتیٔ اعظم مقرر کر دیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب "خواتین اور دین کی خدمت" میں اپنے استاد مولانا حیدر حسین خاں صاحبؒ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"ان (مولانا مفتی عبدالقیومؒ) کے پاس جب کوئی مقدمہ آتا اور اس میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے اور اس فکر میں پڑ جاتے کہ اس مسئلہ کا شرعی حکم کیا ہے تو کہتے ابھی آتا ہوں اور گھر میں جا کر اہلیہ سے جو حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کی صاحبزادی تھیں، پوچھتے، کیا آپ نے اپنے والد صاحب سے کوئی روایت سنی ہے یا اس مسئلہ میں آپ کے علم میں کوئی بات ہے؟ اور آکر فیصلہ کرتے اور بعض اوقات تو بلا تکلف کہہ دیتے کہ ذرا بیوی صاحبہ سے پوچھ آؤں۔"

جس خاتون سے بھوپال کے مفتی اعظم پیچیدہ دینی مسائل میں مشورہ کرتے ہوں اس کے علم و فضل کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی شرف خانم

تیرھویں صدی ہجری میں ترکی کی مشہور شاعرہ ہوئی ہے۔ ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئی اور اسی صدی کے اخیر میں وفات پائی۔ وہ شیخ الاسلام عاشر آفندی کی اولاد سے تھی۔ اس کو بہت سے مروجہ علوم پر عبور حاصل تھا۔ اس کا دیوان مشہور و معروف ہے۔ (مشاہیر النساء)

نواب ملکہ کشور صاحبہ

نواب اودھ امجد علی شاہ (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء تا ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء) کی بیگم اور آخری نواب اودھ واجد علی شاہ (۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تا ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) کی والدہ تھیں۔ اصل نام تاج آرا بیگم تھا۔ نواب حسین الدین خاں کی بیٹی تھیں جو اودھ کی شاہی فوج میں رسالدار تھے۔ ل

تاج آرا بیگم کی شادی امجد علی شاہ سے ان کے زمانۂ ولی عہدی میں ہوئی۔ سسرال سے انہیں "خاتونِ معظمہ بادشاہ بہو نواب ملکہ کشور صاحبہ" کا خطاب عطا ہوا۔ امجد علی شاہ سے ملکہ کشور کی تین اولادیں ہوئیں۔ پہلی خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی شاہ جو بعد میں "سلطانِ عالم واجد علی شاہ" کے نام سے تاجدارِ اودھ ہوئے ۔ دوسری سکندر مرزا جواد علی، جو اودھ کی فوج کے سپہ سالار بنائے گئے اور اسی بنا پر عوام و خواص میں جرنیل صاحب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ تیسری نواب شرف النساء جن کی شادی نواب منیر الدولہ کے بیٹے نواب سرفراز الدولہ سے ہوئی۔

ملکہ کشور صاحبہ اور نواب امجد علی شاہ کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار رہے مگر جب امجد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں بادشاہ بننے کے بعد دو اور شادیاں کیں تو میاں بیوی میں ناچاقی ہو گئی، لیکن وزیر اعظم اور دوسرے اعیانِ سلطنت کے سمجھانے بجھانے سے ملکہ کشور صاحبہ راضی برضا ہو گئیں اور پہلے کی طرح ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگیں۔

ملکہ کشور صاحبہ کی علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ فارسی بخوبی پڑھ لکھ لیتی تھیں۔ قرآن پاک بھی پڑھتے اور سننے کا شوق تھا۔ ایک مولوی صاحب کو صرف اس کام پر مقرر کر رکھا تھا کہ وہ روزانہ ان کو کلام پاک پڑھ کر سنایا کریں۔ ملکہ کا معمول تھا کہ وہ روزانہ کچھ دن چڑھے توشہ خانے میں پسِ پردہ بیٹھ جاتیں اور مولوی صاحب

آکر بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دیتے۔ وہ کافی دیر تک بڑی عقیدت سے کلام پاک سنتی رہتیں۔ بہت مخیر تھیں اکثر غریب اور بیکس عورتوں کو محل میں بلالیتیں اور ان کو انعام واکرام دے کر رخصت کرتیں۔ ان کا ایک محل (چھتر منزل) لب دریا واقع تھا۔ ایک دن اس کی بالائی منزل میں بیٹھ کر چڑھے ہوئے دریا کا نظارہ کر رہی تھیں کہ ایک بڑھیا کو دریا میں بہتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے پکار کر خادماؤں کو حکم دیا کہ فوراً چند آدمی بھیجو اور اس بڑھیا کو پانی سے نکلواؤ۔ غریب بڑھیا کی جھونپڑی سیلاب میں بہہ گئی تھی اور وہ اس کا ایک کونہ پکڑے دریا میں بہتی چلی جاتی تھی۔ ملازمین شاہی نے اس کو پانی سے نکال کر کنیزوں کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے اس کا جسم خشک کیا اور پھر کپڑے بدلوا کر ملکہ کے سامنے حاضر کیا۔ اس نے بتایا کہ میرے سب رشتہ دار مر کھپ چکے ہیں اور اب میرا کوئی والی وارث نہیں۔ ملکہ نے اس کو بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا اور تین روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جو اس سستے زمانے میں ایک آدمی کے باطمینان زندگی گزارنے کے لیے کافی تھا۔

۱۲۶۳ھ ۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ نے وفات پائی اور واجد علی شاہ تخت اودھ پر بیٹھے۔ انہوں نے والدہ کا اعزاز واکرام برقرار رکھا اور وہ "جناب عالیہ" کے خطاب سے ملقب ہوئیں۔ اس زمانے میں وہ رات گئے تک قرآن کریم کی تلاوت کرتی رہتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی دانشمند، نیک سرشت اور عالی دماغ خاتون تھیں۔ سلطنت میں ان کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے بادشاہ بیٹے کو فہمائش بھی کرتی تھیں لیکن وہ ان کو پلٹ کر کبھی جواب نہ دیتے تھے۔ ۳ جمادی الاول ۱۲۷۲ھ بمطابق ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ ضبط ہو کر انگریزی مقبوضات میں شامل کر دی گئی تو ملکہ کشور کو بے حد قلق ہوا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ میں انگلستان جا کر ملکہ وکٹوریہ کے پاس فریاد کروں گی، وہ بھی صاحب اولاد ہیں ان سے درخواست کروں گی کہ اودھ کی سلطنت میرے فرزند کو واپس کر دیں۔ یہ اعلان سن کر ملازمین میں کہرام مچ گیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ سرکار کو تو دریا سے بھی خوف محسوس ہوتا ہے بڑے بڑے سمندروں کو کیسے پار کریں گی؟ لیکن ملکہ کشور بڑی باہمت خاتون تھیں وہ

اپنے ارادے پر قائم رہیں اور اپنی مصاحب خاص بہار النساء کو سفر کی تیاری کا حکم دے دیا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو ملکہ اپنے چند خاص ملازمین کو ساتھ لے کر اپنے بیٹے واجد علی شاہ معزول شاہِ اودھ کے پاس کلکتہ روانہ ہو گئیں باقی عملہ کو جواب دے دیا یا بعض کو پنشن دے دی۔ کلکتہ پہنچیں تو واجد علی شاہ نے خود ان کے ساتھ ولایت جانے کا ارادہ کیا مگر وہ اچانک بیمار ہو گئے اور طبیبوں نے بحری سفر کرنے سے منع کر دیا۔ ملکہ کشور اب اپنے دوسرے بیٹے مرزا اسکندر حشمت جواد علی جرنیل صاحب، ولی عہد پرنس حامد علی، مولوی مسیح الدین مختارِ عام شاہِ معزول اور بہت سی خادماؤں اور ملازموں کے ساتھ ۱۸ جون ۱۸۵۶ء کو انگلستان روانہ ہو گئیں۔ کلکتہ سے چلتے وقت واجد علی شاہ کے بچوں سے مل کر بہت روئیں۔ ان کے قافلے میں ایک سو چالیس آدمی تھے اور پانچ سو صندوق مال اسباب کے تھے۔ بدقسمتی سے سویز کے مقام پیران کے ملازم کے ہاتھ سے ایک خاصدان سمندر میں گر گیا اس میں نہایت بیش قیمت جواہر تھے۔ غوطہ خوروں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود۔ ملکہ کو اس نقصان کا بہت دکھ ہوا لیکن پھر کمرِ ہمت باندھ لی۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۶ء کو یہ قافلہ لندن پہنچ گیا۔ لندن کے دورانِ قیام میں ملکہ کشور صاحبہ کی ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات ہوئی جو بہت امید افزا تھی مگر مئی ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے اسے غدر کا نام دیا اور ملکہ کشور کے قافلے سے نفرت اور بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔ اس پر ملکہ کشور اپنے ساتھیوں کو لے کر پیرس (فرانس) چلی گئیں۔ وہاں ان کا دیرینہ مرض کثرتِ استحاضہ عود کر آیا۔ اسی کی وجہ سے ۲۱ فروری ۱۸۵۸ء کو انتقال کر گئیں۔ قبر کے لیے چار پانچ مربع گز قطعۂ اراضی دس ہزار روپے میں خریدا گیا۔ جنازہ کے جلوس میں ترکی اور ایران کے سفیر اور فرانس کے کچھ وزراء اور دوسرے اکابر بھی شریک تھے۔ قبر پر تین ہزار روپیہ کے مصارف سے سنگِ مرمر کا چبوترہ بنوا دیا گیا۔ ان کی تدفین کے بعد مرزا اسکندر حشمت لندن واپس آ گئے مگر مبرزمین ناسور ہو جانے کی وجہ سے تپِ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور ۸ مارچ ۱۸۵۸ء کو وہ بھی فوت ہو گئے۔ لاش لندن سے پیرس لائی گئی۔ ان کا جنازہ حکومتِ فرانس کی طرف سے فوجی اعزاز کے ساتھ اٹھایا گیا اور انہیں ماں کے پہلو میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس کے چند دن بعد ان کی کمسن بچی رافت آرا بیگم بھی وفات پا گئی اور فرانس ہی میں دفن کی گئی۔ قافلے کے باقی لوگ ناشاد و نامراد ہندوستان واپس آ گئے۔ (بیگماتِ اودھ)

ملکہ بزم عالم

عثمانی فرمانروا سلطان محمود خاں ثانی (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء تا ۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء) کی ملکہ اور سلطان عبد المجید خاں (۱۲۵۵ھ/۱۸۳۹ء تا ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۱ء) کی والدہ تھی۔ نہایت دیندار، مخیّر اور نیک سیرت خاتون تھی۔ اس نے استنبول (قسطنطنیہ) میں "نیکی باغچہ" کے پاس ایک عظیم الشّان شفاخانہ (ہسپتال) بنوایا جس میں بیسیوں مریض زیرِ علاج رہتے تھے۔ اس شفاخانے کے صحن میں ملکہ نے ایک باغ بھی لگوایا، جس سے مریضوں کو بڑی فرحت حاصل ہوتی تھی۔ شفاخانے کے اخراجات پورا کرنے کے لیے نیک نہاد ملکہ نے ایک بہت بڑی جائداد وقف کر دی اور ہدایت کی کہ مریضوں کا نہ صرف علاج مفت کیا جائے بلکہ ان کو غذا اور لباس وغیرہ بھی اس وقف کی آمدنی سے مہیّا کیا جائے۔

ملکہ نے قسطنطنیہ کے محلہ توپ خانہ کے قریب ایک عظیم الشّان جامع مسجد بھی بنوائی۔ جو "ینی والدہ جامع" کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں ملکہ نے گولڈن ہارن پر ایک نیا پل بنوایا جو "والدہ سلطان کبریٰ" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ پل عین وسطِ شہر میں بنایا گیا اور قسطنطنیہ کی تجارت کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

اسی طرح ملکہ نے رفاہِ عامہ کے اور بھی بہت سے کام کیے۔ اپنے نیک کاموں کی بدولت وہ ترکی میں بڑی عزّت و احترام سے یاد کی جاتی ہے۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ سی ڈبلیو ولسن)

بی بی آسیہ خانم

ایران کے ایک قبیلہ بوخاری باش کے سردار مُحمّد خاں عزیز الدّینلو کی صاحبزادی تھیں۔ایران کے شاہی (قاچاری) خاندان میں بیاہی گئیں۔ان کے بطن سے فتح علی شاہ قاچار پیدا ہوا جس نے ایران پر سنہ ۱۲۱۱ھ ۱۷۹۶ء سے ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء تک حکومت کی۔

آسیہ خانم بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔خدمت خلق سے خاص شغف تھا اور صدقہ و خیرات بہت کثرت سے کرتی تھیں۔اپنی ساری عمر عبادتِ الٰہی اور اعمالِ حسَنہ میں گزاری۔اہل ایران ان کی ولایت کے قائل ہیں۔ذی الحجہ سنہ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۹ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں۔اس مقدّس سفر سے طہران واپس آکر اسی سال وفات پائی۔لاش نجف اشرف (عراق) لے جائی گئی اور وہیں سپردِ خاک کی گئی۔

(مشاہیر نسواں)

عائشہ تیموریہ

مصر کی نامور شاعرہ تھی۔ سنہ ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئی اور دینی و دنیوی علوم کی تعلیم پاکر علمی و ادبی اعتبار سے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا۔اس کو عربی فارسی اور ترکی تینوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔عربی زبان میں مشقِ سخن کرتی تھی۔کلام نہایت دلکش اور فصیح و بلیغ ہوتا تھا۔اس کا دیوان "حلیۃ الطراز" کے نام سے چھپ چکا ہے۔اس کے ایک قصیدے نے بڑی شہرت پائی۔اس قصیدے کا مطلع ہے:

بید العفاف اصون عزّ حجابی

(اپنی عفّت کے ہاتھ سے اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہوں)

عائشہ تیموریہ نے سنہ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں وفات پائی۔

(مسلمان عورتوں کی دینی اور علمی خدمات)

شرافت محل

سیّد ناصر علی دہلوی کی صاحبزادی اور سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر بہادر شاہ (ثانی) بادشاہ کی بیگم تھی۔ اس نے بچپن میں بہت اعلیٰ تعلیم پائی۔ بڑی علم دوست، دیندار اور فیّاض خاتون تھی۔ علماء و فضلا کی بہت قدردان تھی اور دل کھول کر ان کی سرپرستی کرتی تھی۔ عبادتِ الٰہی سے بڑا شغف تھا۔ چنانچہ اس کا بیشتر وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ جہالت سے بہت نفرت تھی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے میں کوشاں رہتی تھی۔

شرافت محل کا نام تو کچھ اور تھا لیکن جب اس کی شادی بہادر شاہ سے ہوئی تو سسرال والوں کی طرف سے اس کو شرافت محل کا خطاب ملا اور اسی خطاب سے اس نے شہرت پائی۔

شادی کے وقت اس کے شوہر ولی عہد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شرافت محل کے بطن سے ان کو بیٹا عطا کیا تو انہوں نے وعدہ کیا کہ بادشاہت ملنے پر وہی بادشاہ بیگم اور ملکہ کہلائے گی اور بادشاہ کے بعد دوسری حیثیت اسی کی ہوگی لیکن جب بہادر شاہ بادشاہ بنے تو حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ وہ اپنا وعدہ ایفا نہ کر سکے۔

اس سے شرافت محل دل برداشتہ ہو گئی اور قلعے کی ریاست اور بادشاہ سے تعلق منقطع کر لیا۔ اس کے بعد وہ ہر وقت یادِ الٰہی میں مشغول رہنے لگی۔ ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کے سلسلے میں شہر دہلی ہنگاموں کا مرکز بنا رہا لیکن وہ سب سے کنارہ کش رہی۔

اس نیک بی بی نے ۱۲۷۹ھ ۱۸۶۱ء میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

گلبدن باجی

شاہِ ایران فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۱ھ / ۱۷۹۶ء تا ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء) کی والدہ آسیہ خانم (وفات ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء) کی کنیز تھی۔ آسیہ خانم کے فیضِ صحبت سے بہت دیندار اور دیانت دار ہو گئی تھی۔ جب آسیہ خانم نے وفات پائی تو بادشاہ نے خُدّامِ حرم سے کہا کہ والدہ مرحومہ کی جگہ کسی ایسی خاتون کو مقرر کرو جو ان کی طرح مقررہ نقد و جنس ہر سال غربا و مساکین اور ملازمین حرم میں تقسیم کر دیا کرے۔ انہوں نے گلبدن باجی کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ گلبدن باجی نے یہ کام ایسے انصاف اور دیانت داری سے کیا کہ سارے ملک میں اس کی ایمان داری کی دھوم مچ گئی۔ اس کی مُہر کا مسجع تھا:

"معتبرِ در ممالکِ ایران۔ فیض صندوقدارِ شاہجہان"

اس کے لین دین سے کیا خُدّام اور کیا تجّار سب خوش تھے۔ وہ کروڑوں کا لین دین کرتی تھی، کیا مجال کہ ایک پیسہ کی بھی ہیرا پھیری ہو جائے۔ بادشاہ نے اس کی کارگزاری سے خوش ہو کر اسے "خازن الدّولہ" کا خطاب دیا اور اس سے شادی کر کے بادشاہ بیگم بنا دیا۔ (تذکرۃ الخواتین)

بی بی صفوت

استنبول (قسطنطنیہ) کی رہنے والی تھی۔ ترکی کی نامی گرامی شاعرہ ہوئی ہے۔ اس کے اشعار اس کے علمی تبحّر کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ ترکی میں اس کے کلام کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بی بی صفوت نے ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

قُرَّۃُ العَین طاہرہ

اصل نام زرّین تاج اور قُرَّۃُ العَین لقب تھا۔ ایران کے نامی گرامی مجتہد حاجی مرزا محمدؐ صالح قزوینی کی بیٹی، ملا محمد کی بیوی اور ملا محمد تقی مجتہد کی حقیقی بھتیجی تھی۔ فارسی تو اس کی مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ اس نے علوم عربیہ ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ کی تعلیم بھی حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قرآنِ پاک بھی حفظ کر لیا تھا۔ نہایت حسین وجمیل، شوخ وطرار اور ذہین تھی۔ طبعاً بڑی آزاد خیال اور ایجاد پسند تھی۔ مرزا علی محمد باب نے بابی مذہب کی بنیاد ڈالی[1] تو وہ اس کی پیروکار بن گئی اور ساتھ ہی برقع کو خیرباد کہہ کر نہایت سرگرمی سے اس مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ مختلف علوم میں درجۂ تبحر رکھنے کے علاوہ وہ ایک نغز گو شاعرہ اور سحرالبیان خطیبہ بھی تھی۔ شاعری میں طوطی اور طاہرہ تخلص کرتی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ

---

[1] مرزا علی محمد ایران کے شہر شیراز کا ایک نوجوان تھا۔ اس نے اوائل عمر میں کربلا جا کر تعلیم حاصل کی تھی اور حج بھی کیا تھا۔ سنہ ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں جبکہ اس کی عمر صرف ۲۴ برس کی تھی۔ اس نے امام غائب (جو اہلِ تشیع کے نزدیک قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے) کا باب یعنی دروازہ یا واسطہ ہونے کا دعویٰ کیا اور ایک عجیب و غریب مذہب کی بنیاد ڈالی جسے بابی مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔ حکومتِ ایران نے اس کے گمراہ کن عقائد اور باغیانہ سرگرمیوں کا بڑی سختی سے محاسبہ کیا اور اسے گرفتار کر کے شیراز کے زندان میں ڈال دیا۔ سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) سے سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) کے اوائل تک شیراز میں، سنہ ۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) سے سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تک اصفہان میں اور اپنی زندگی کے آخری چھ ماہ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

طاہرہ کا لقب اس کو محمد علی باب نے دیا تھا۔
ناصر الدین شاہ قاچار (۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء تا ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) کے عہدِ حکومت میں اس نے اپنی پُرجوش اور گمراہ کُن تقریروں اور تحریروں سے سارے ایران میں زبردست ہلچل ڈال دی۔ وہ بڑے بڑے مجمعوں میں کھڑے ہو کر ایسی فصاحت و بلاغت سے تقریر کرتی تھی کہ لوگ مسحور ہو جاتے تھے اور زار زار روتے تھے۔ اس کا حسن و جمال دیکھ کر بڑے بڑے فرزانے ہوش و حواس کھو دیتے تھے، اور بڑے بڑے فصیحانِ عجم اس کا کلامِ بلاغت نظام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے۔ بعض لوگ محض اس کے دیدار کا شوق پورا کرنے کے لیے بابی مذہب میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

وہ چہریک یا ماکو کے قلعہ میں قید رہا۔ اس دوران میں اس کے پیروؤں اور مخالفوں کے درمیان کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ بالآخر علی محمد باب اور اس کے دو ساتھیوں سید حسین اور آقا محمد علی کو موت کی سزا سنائی گئی۔ ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء میں ان کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

علی محمد باب کے عقائد سخت گمراہ کُن تھے اور اس کی تعلیمات کو اسلام سے دُور پار کا تعلق بھی نہ تھا۔ اس کے عقائد اور تعلیمات کے خدوخال یہ تھے۔

(۱) نہ کوئی پیغمبر آخری پیغمبر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی الہامی کتاب آخری الہامی کتاب ہو سکتی ہے۔

(۲) جنت و دوزخ کا کوئی مادی وجود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی اندرونی حالتوں کے نام ہیں۔

(۳) مرنے کے بعد جسم کا دوبارہ احیا ناممکن ہے۔

(۴) یوم الحساب (یوم الدین) کوئی چیز نہیں۔ ہر انسان کے اعمال ہی اس کے فرشتے ہیں جو اس کو نیکی یا بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

داخل ہوجاتے تھے ۔ غرض وہ بابی مذہب کی روحِ رواں بن گئی تھی۔ اس کی تقریریں سننے کی خاطر بڑے بڑے وسیع میدانوں میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوجاتا تھا کہ کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔ جب پہلے پہل اس نے قزوین میں بابی مذہب کی کھُلم کھلا تبلیغ شروع کی تو اس کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن وہ باز نہ آئی اور بہت سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر وہ کربلا اور بغداد گئی اور وہاں بھی زور شور سے بابی مذہب

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

(۵) اللہ کی ذات ابدی ہے جسے حاصل نہیں کیا جا سکتا اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وسیلہ ضروری ہے۔ مشیتِ ازلی ایک الگ طاقت ہے جو نبیوں میں ظہور کرتی ہے اور نبی مشیتِ ازلی کے اوتار یا مظہر ہوتے ہیں۔ مشیتِ ازلی نے اس زمانے میں علی محمد باب کی صورت میں ظہور کیا ہے اور لوگ اسی کے وسیلے سے ذاتِ باری تعالیٰ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

علی محمد باب نے اپنے قتل سے پہلے ایک بیس سالہ نوجوان مرزا یحییٰ بن مرزا بزرگ نوری اپنا جانشین مقرر کیا اور اسے صبح ازل کا خطاب عطا کیا لیکن اس کے بڑے (سوتیلے) بھائی بہاء اللہ نے مشیتِ ازلی کا مظہر ہونے کا دعویٰ کر دیا، اس طرح بابیوں کے دو فرقے بن گئے۔ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں صبح ازل اور بہاء اللہ دونوں بغداد چلے گئے اور بارہ تیرہ سال تک بغداد بابی مذہب کا مرکز بنا رہا۔ (پہلے دس سال تک بہاء اللہ صبح ازل ہی کو اپنا پیشوا تسلیم کرتا رہا لیکن بعد میں وہ اس سے منحرف ہو گیا۔)

۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۸ء میں حکومتِ ترکی نے صبح ازل کو جزیرہ قبرص میں بھیج دیا، جہاں وہ ضعیف العمری کے عالم میں فوت ہوا۔ بہاء اللہ کو ترکی حکومت نے عکہ میں نظر بند کر دیا جہاں وہ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء میں فوت ہوا۔ اس کے دو بیٹوں عباس آفندی اور مرزا محمد علی میں گدی پر بیٹھنے کے لیے کشمکش ہوئی اور دونوں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی تبلیغ کرتی رہی۔ بغداد سے لوٹ کر وہ کرمان شاہ اور ہمدان گئی۔ وہاں سے اس نے پایۂ تخت (تہران) جاکر خود شاہِ ایران کو بابی بنانے کا قصد کیا۔ اس کے والد اور دوسرے اعزہ نے بہت سمجھایا اور بابی مذہب ترک کرکے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی تلقین کی لیکن اس مذہب سے اس کا لگاؤ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا نہ وہ اسے چھوڑنے پر تیار ہوئی اور نہ اپنی بے پردگی اور غیرِ معمولی آزادی میں کوئی کمی کرنے پر آمادہ ہوئی۔ قرۃ العین کے علاوہ بابیوں کے کئی اور پُرجوش مبلغ بھی تھے۔ انہوں نے کئی موقعوں پر اپنے ہم مسلک لوگوں کو ساتھ ملاکر حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے لیکن ہر مرتبہ ان کی شورش کو کچل دیا گیا۔ بابیوں نے اپنے کئی مخالفین کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس سلسلے میں قرۃ العین اپنے متعدد ساتھیوں سمیت گرفتار ہوئی۔ کچھ عرصہ وہ قید خانے میں رہی لیکن پھر اسے رہا کرکے شہر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا، وہاں سے وہ مازندران گئی اور وہاں زور شور سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد بدشت جاکر وہاں کے علماء سے مناظرہ کیا۔ پھر بدشت سے بندنور گجور گئی۔ وہاں اس کے بہت سے ساتھی حکومت کے خلاف سرگرمیوں

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

نے اپنے الگ الگ فرقے بنا لیے۔ عباس آفندی نے عبدالبہا کا لقب اختیار کرکے اپنے سلسلے کو بہائی کا نام دیا۔ یہ بابی مذہب کی ترمیم شدہ صورت تھی۔ زیادہ تر بابی عبدالبہا کے دامنِ ارادت سے وابستہ ہو گئے مگر جبکہ ایک قلیل جماعت مرزا محمد علی کو اپنا پیشوا مانتی رہی۔ اب بھی بہائی دنیا کے کچھ ملکوں میں موجود ہیں۔ وہ بڑے محتاط طریقے سے اپنے مذہب کی اشاعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن علمائے اسلام کے نزدیک اس مذہب کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے اس لیے مسلمانوں پر ان کی تبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے خلاف نفرت پیدا ہوتی ہے۔

(تاریخ اسلام۔ پروفیسر براؤن)

میں مصروف تھے۔ قرۃ العین کو گرفتار کر کے تہران لایا گیا اور ناصر الدین شاہ قاچار کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ اور اس کے امیروں نے اسے بہت سمجھایا کہ اب بھی وہ راہِ راست پر آجائے تو اسے معاف کر دیا جائے گا لیکن وہ نہ مانی، آخر شاہ کے حکم سے وہ ایک مکان میں نظر بند کر دی گئی۔

۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء میں تین انتہا پسند بابیوں نے ناصر الدین شاہ قاچار پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن وہ معمولی زخمی ہوا۔ ایک حملہ آور مارا گیا اور دو کو بادشاہ کے محافظوں نے گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ قرۃ العین کو ایک بار پھر بابی مذہب چھوڑنے کے لیے کہا گیا لیکن وہ نہ مانی، آخر اسے متعدد دوسرے بابیوں کے ساتھ موت کی سزا دی گئی۔ (اس سے پہلے علماء سے ان کے قتل کا فتویٰ حاصل کر لیا گیا) کہا جاتا ہے کہ بابیوں کو مختلف فرقوں کے لیڈروں کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ انہیں اپنے گھروں میں لے جا کر جس طرح چاہیں قتل کریں۔ ان لوگوں نے اپنے قیدیوں کو سخت اذیتیں دے کر ہلاک کیا۔ قرۃ العین کو کس طریقے سے ہلاک کیا گیا، اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک یہ کہ ایک رات کو اس کا گلا گھونٹ کر اس کی لاش کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ دوسری یہ کہ اسے ایک میدان میں ہزاروں لوگوں کے سامنے سرکاری جلّاد نے قتل کیا۔ پھر اس کے تمام کاغذات جلا دیئے گئے (واللہ اعلم)۔

قرۃ العین صاحبِ دیوان تھی لیکن اب اس کا کلام چند غزلوں اور ایک مثنوی کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔ افسوس کہ قرۃ العین نے اپنی ذہانت اور لیاقت کو اسلام کی بیخ کنی میں صرف کیا۔ اگر اسلام کی خدمت میں صرف کرتی تو آج دنیائے اسلام میں اس کی بے حد قدر و منزلت ہوتی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

غزل

(۱) گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو | شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مُو بمُو
(۲) از پئے دیدنِ رُخت ہمچو صبا فتادہ ام | خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بکوچہ، کو بکو

(۳) میرود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بجو

(۴) در دہانِ تنگِ تو عارض و عنبرین خطت
غنچہ بہ غنچہ، گل بہ گل، لالہ بہ لالہ، بُو بہ بُو

(۵) ابرو و چشم و خالِ تو صید نمودہ مرغِ دل
طبع بہ طبع، دل بہ دل، مہر بہ مہر، خُو بہ خُو

(۶) مہرِ ترا دلِ حزین یافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو

(۷) در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو[۱]

ترجمہ:

(۱) اگر مجھے تیرے روبرو دیکھنے اور آمنے سامنے آنے کا موقع ملے تو میں تیرے غم کی شرح نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو کروں۔

(۲) میں تیرے چہرے کے دیدار کے لیے بادِ صبا کی مانند گھر گھر در در کوچہ کوچہ اور گلی گلی پھرتی ہوں۔

(۳) تیرے فراق میں میری دونوں آنکھوں سے دجلہ دجلہ، دریا دریا، چشمہ چشمہ اور نہر نہر خون بہہ رہا ہے۔

(۴) تیرے دہنِ تنگ، عارض اور عنبریں خط کی مثال غنچے، گلاب، لالہ کے پھولوں اور خوشبو جیسی ہے۔

(۵) تیرے ابرو، آنکھ اور خال نے مزاج، محبت اور خوخصلت سے میرے مرغِ دل کو اسیر کر لیا ہے۔

(۶) میرے غم زدہ دل نے تیرے عشق کو جان کے تانے بانے میں بُن لیا ہے۔

(۷) طاہرہ نے اپنی کتابِ دل کا ایک ایک صفحہ ایک ایک تہہ اور ایک ایک پردہ دیکھ لیا لیکن وہاں تیرے سوا کچھ بھی نہ پایا۔

---

[۱] اردو کے ایک شاعر جناب نشتر لکھنوی کی تضمین ملاحظہ کیجئے۔ یہ رسالہ سہیلی لاہور کے ۲۵ جون ۱۹۳۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

(۱)
آنکھ کو شوقِ دید، قلب میں تیری آرزو ——— لب پہ ہے تیری گفتگو، دل میں ہے تیری جستجو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

غزل

(۱) جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم والبلا
ہمہ عاشقانِ شکستہ دل کہ دہند جان برہ ولا

(۲) اگر آں صنم زرہِ ستم پے کشتنِ بنہد قدم
لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضیٰ

(۳) سحر آں نگارِ ستمگرم قدمے نہاد بہ بسترم
واذا رایت جمالہٗ طلع الصباح کانما

(۴) نہ چو زلفِ غالیہ بارِ او نہ چو چشمِ فتنہ شعارِ او
شدہ نافعۂ ہمہ ختن شدہ کافرے ہمہ خطا

(۵) تو کہ غافل از مے وشاہدے پئے مرد زاہد عابدے
چہ کنم کہ کافر وجاحدی ز خلوصِ نیّتِ اصفیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

دیکھتا ہوں جدھر جدھر، میری نظر میں تو ہی تو — گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

(۲)

ڈیر کی سیر کی کبھی اور کبھی گیا حرم
مشتِ غبار اڑا کیا، دشتِ جنوں میں دمبدم
چھانی گلی گلی کی خاک تیری تلاش میں صنم
از پئے دیدنِ رُخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو

(۳)

ہجر میں تیرے اے صنم زندگی ہو گئی ستم
آہ فغاں ہے دمبدم، گھیرے ہے لشکرِ الم
دل ہے ہمارا اور ہم، آنکھیں ہیں اور اشکِ غم
میرود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بجو

(۴)

تو ہی مکیں تو ہی مکاں تو ہی زمیں تو ہی آسماں
دل کے حجاب میں نہاں، دیدۂ نور سے عیاں
ہر بنِ مو ہے صد زباں، عشق کی تیری داستاں
مہرِ ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ بہ رشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو

(۵)

حسن میں عشوہ و ادا، عشق میں نالہ و بکا
پردہ میں لیلیٰ حیاد، دشت میں قیسِ بے نوا
دیر و حرم میں جابجا، تیرے ہی نام کی صدا
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بتو

(۶) تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں نکوست تو درخوری و گر ایں بدست مرا سزا

(۷) بمرادِ زلفِ معلّقی پے اسپ و زین مغرقی
ہمہ عمر منکر مطلقی زِ فقیرِ فارغِ بے نوا

(۸) بگزر ز منزلِ ما و من بگزیں بملکِ فنا وطن
فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشاء

ترجمہ:

(۱) تیرے جذباتِ عشق نے تمام شکستہ دل عُشاق کو غم اور بلا کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے تاکہ وہ محبت کی راہ میں جانیں دے دیں۔

(۲) اگر محبوب ازراہِ ستم میرے قتل کے لیے قدم اٹھائے تو میں اس کی رضا پر راضی ہوں۔

(۳) سحَر کو میرے ستم گر محبوب نے میرے بستر پر قدم رکھا تو مجھے اس کا جمال دیکھ کر یوں لگا جیسے صبح طلوع ہو گئی ہو۔

(۴) نہ اس کی معطّر زلف کا سا کوئی نافہ سارے ختن میں ہوا ہے اور نہ اس کی فتنہ شعار آنکھوں کا سا کوئی کافر ملک ختا میں گزرا ہے۔

(۵) تو جو شراب و شاہد سے غافل ہے اور عابد و زاہد کی پیروی کرتا ہے میں کیا کروں کہ تو پاک دل لوگوں کے خلوصِ نیت کا منکر ہے۔

(۶) تو ہے اور ملک و جاہِ سکندری ہے، میں ہوں اور رسم و راہِ قلندری ہے اگر وہ اچھا ہے تو تجھے مبارک ہو اور اگر یہ برا ہے تو میں اس کی حقدار ہوں۔

(۷) تو لمبی زلف کا طالب ہے اور گھوڑے اور جڑاؤ زین کی جستجو میں ہے تو عمر بھر بے نیاز اور بے نوا فقیر کا منکر ہی رہا۔

(۸) "ما" اور من کی منزل سے گزر جا، ملکِ فنا کو اپنا وطن بنا لے جب تو ایسا کرے گا تو یقیناً اپنے مقصد کو پا لے گا۔

(مشاہیرِ نسواں۔ قرۃ العین طاہرہ (مارتھا روٹ))

بی بی کیفی

شروع تیرھویں صدی ہجری میں تیموری خاندان کی ایک شہزادی ہوئی ہے بہت اونچے درجے کی شاعرہ تھی۔ اس نے بھی کئی دوسرے نامور شعراء کی طرح قدسی کی زندۂ جاوید نعت پر ایک خمسہ لکھا ہے جس کے چند بند درج ذیل ہیں:

کس کا منہ ہے جو کرے مدح تری میرے نبی | نعتِ اطہر یہی ہے جب شخصِ ذکی محض غبی
حبذا ذات تری مایۂ حاجت طلبی | مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!

نور تھا تیرا دہاں نورِ حقیقت سے بہم | دیکھ کر موسیِ عمراں ہوئے غش شاہِ امم
اور مہرِ رُخِ تاباں پہ ہے کیا ہی عالَم | من بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال ست بدیں بوالعجبی!

مہبطِ روح القدس آپ کی ذاتِ والا | عرشِ اعظم درِ دولت پہ کہے صَلِّ علیٰ
عظمتِ رتبۂ والا ہو شہا کس سے ادا | نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی!

نور سے تیرے منوّر ہے زمیں دشت بدشت | تو ہی بانی ہے بنائے فلکِ زریں طشت
نہ فلکِ ہشت جناں کی نہ خوش آئی گلگشت | شبِ معراج عروجِ تو از افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی!

حق تعالےٰ نے کیا آپؐ کو ابرِ اکرام | تجھ سے خنداں ہے لبِ غنچۂ امیدِ انام
ہیں شجر اور حجر غرقِ سحابِ اکرام | نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی!

ذاتِ انور سے بنا سارا جہاں عالمِ نور | اور فروغ اس کے سے ہر خانہ ہے معمور

رب عزت کو جو اعزازِ عرب تھا منظور | ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

رُتبہ ترے سگِ کو کا ہے اے شاہِ امم | سر بپا اس کے رہا شیرِ فلک بھی مردم
رشکِ افزائے ملائک ہے سوائے آدم | نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم

زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

فرقتِ روئے مقدس میں نہیں تابِ حیات | زہر پی جاؤں پلائیں جو مئے نابِ حیات
تشنۂ وصلتِ اقدس نہیں سیرابِ حیات | ماہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ زحد میگزرد تشنہ لبی

چشم ہے آپ سے اے شاہِ سرافرازِ نظر | نظرِ لطف سے عصاۃ پہ ہو بازِ نظر
تا کریں خلدِ بریں پر بھی وہ با نازِ نظر | چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر

اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی!

دردِ عصیاں سے ہے بیتاب نہایت کیفی۔ | حکمتِ لطف سے اس درد کے تم ہو شافی
عازمِ درگہہ کیفی ہے مثالِ قدسی | بسیّدی انتَ حبیبی وطبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسیؔ پئے درماں طلبی

(مشاہیرِ نسواں)

سری خانم

دیار بکر کی رہنے والی ایک ترک خاتون تھی۔ سن ۱۲۳۰ھ ہجری میں پیدا ہوئی۔ ترکی زبان کی نغز گو شاعرہ تھی۔ فی الحقیقت اس کو شعر و سخن میں درجۂ کمال حاصل تھا اور تمام سلطنتِ عثمانیہ میں اس کا کلام بلاغت نظام پڑھا اور سنا جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہ اس نے کب اور کہاں وفات پائی۔ (مشاہیر النساء)

حیات النساء بیگم حیاؔ

شاہ عالم ثانی کی بیٹی تھی۔ بڑی عالمہ فاضلہ خاتون تھی۔
اصل نام حیات النساء بیگم تھا لیکن عام طور پر بھورا بیگم کے نام سے مشہور تھی۔ شعر و سخن سے خاص لگاؤ تھا۔ حیاؔ تخلص تھا اور شاہ نصیر دہلوی (المتوفی ۱۲۷۲ھ) کو اپنا کلام دکھاتی تھی۔ وہ بڑی شفقت اور توجہ سے اصلاح دیتے تھے۔ اس نے عمر بھر شادی نہ کی کیونکہ اپنے خاندان کو مصیبت اور ادبار میں دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔
طویل عمر پا کر اس دنیا سے رخصت ہوئی ـــــ یہ شعر اسی کا ہے:

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آ گیا ناقص
حیا ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

(تذکرۃ النساء)

بی بی فطنت خانم

ترکی کی مشہور و معروف شاعرہ ہوئی ہے۔ ۱۲۵۸ھ میں پیدا ہوئی اور سنِ رُشد کو پہنچنے کے بعد شعر و شاعری میں وہ نام پیدا کیا کہ نہ صرف ترکی بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اس کے کلام بلاغت نظام کی شہرت پھیل گئی۔ اس کے اشعار ترکوں میں مشہور ہیں۔ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

ملکہ زینت محل

سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین ظفر بہادر شاہ (ثانی) شاہِ دہلی کی سب سے چہیتی بیگم تھی۔ اس کے والد کا نام نواب فرخ جاہ بہادر صمصام الدولہ احمد قلی خان تھا جو احمد شاہ دُرّانی کے خاندان سے تھا۔ وہ بہادر شاہی دربار کا خاص رکن اور دہلی کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ زینت محل بہ اختلافِ روایت ۱۲۲۹ھ ۱۸۱۴ء یا ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئی۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی عالمہ فاضلہ خواتین مقرر کیں۔ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال اور اوصافِ حمیدہ کا چرچا سارے شہر میں پھیل گیا۔ بہادر شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے نواب احمد قلی خان سے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ نواب صاحب رضامند ہو گئے اور اپنی لختِ جگر کی شادی بادشاہ سے کر دی۔ اس وقت زینت محل کی عمر سولہ اور بیس سال کے درمیان تھی اور بہادر شاہ کی پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان۔ زینت محل بہت جلد بادشاہ کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو گئی۔ اس نے شاہی محل (لال قلعہ) میں آکر نئی نئی قسم کی پوشاکیں اور نئی نئی طرح کے کھانے ایجاد کیے جن کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں زینت محل کے بطن سے شہزادہ جواں بخت پیدا ہوا اور بادشاہ کی نظروں میں اس کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ جواں بخت کے ہوش سنبھالنے سے لے کر ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء تک زینت محل اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے میں کوشاں رہی مگر انگریزوں کے سامنے بے بس ہونے کی وجہ سے وہ آخر دم تک اپنی یہ حسرت پوری نہ کر سکی تاہم بہادر شاہ نے اس کی دلداری اور دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے ملکہ کے لیے ایک عالی شان محل

تعمیر کرایا جس کا نام زینت محل رکھا اور اس کے دروازے پر یہ تاریخ کندہ کرائی ؎

کرد اے ظفر زینت محل تعمیر قصرِ بے بدل
شد محل سالِ بنا ایں خانۂ زینت محل

بہادر شاہ نے پہلے مرزا دارا بخت کو ولی عہد مقرر کیا۔ ۱۸۳۹ء میں وہ فوت ہوگیا تو مرزا شاہ رُخ ولی عہد قرار پایا۔ جب وہ بھی ۱۸۴۷ء میں انتقال کرگیا تو مرزا فتح الملک کو ولی عہد بنایا گیا لیکن وہ بھی جلد ہی فوت ہوگیا اب بہادر شاہ نے جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرنا چاہا مگر انگریز شاہی خاندان کو (بہادر شاہ کی موت کے بعد) قلعے سے نکالنے اور اس کی رہی سہی وقعت کو ختم کرنے کا ارادہ کرچکے تھے۔ انھوں نے مرزا فخرو سے خفیہ طور پر اپنی شرطیں منوالیں اور اسے ولی عہد بنا دیا۔

۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کا بھی انتقال ہوگیا تو بہادر شاہ نے ایک کاغذ پر تمام شہزادوں سے دستخط کرا لیے کہ وہ جواں بخت کو ولی عہد مانتے ہیں، اس پر انگریزوں نے مرزا قویاش کو بھڑکا کر ولی عہدی کا دعویدار بنا دیا۔ یہی کشمکش جاری تھی کہ مئی ۱۸۵۷ء میں اہلِ ہند نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کردی، اور جنگِ آزادی کا آغاز ہوگیا۔ اس سلسلے میں انگریزوں اور حریت پسندوں میں دلی پر قبضے کے لیے کئی خونریز معرکے ہوئے۔ ان معرکوں کے دوران میں زینت محل نے دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش کی تاکہ فتح جس فریق کی بھی ہو اس کی حامی نظر آنے لگے۔ اس کے دل میں جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی خواہش اس قدر شدید تھی کہ اس پُرآشوب زمانے میں بھی اس نے خفیہ طور پر انگریزوں کو یہ پیغام بھیجنے کی کوشش کی کہ اگر جواں بخت کو ولی عہد مان لیا جائے تو وہ بادشاہ پر اس مقصد کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے گی کہ وہ انگریزوں کی حمایت اور پناہ حاصل کرے۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ انگریزوں نے دِلّی پر قبضہ کرنے کے بعد بادشاہ کو گرفتار

کرلیا اور مقدمہ چلاکر اس کو جلا وطنی کی سزا دی۔

۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو بہادر شاہ، زینت محل اور جواں بخت کو تیرہ متعلقین کے ساتھ دلّی سے رنگون کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ۹ دسمبر کو یہ قافلہ رنگون پہنچا جہاں انہیں لکڑی کے ایک بنگلہ نما مکان میں ٹھہرایا گیا۔ جلا وطنی کا زمانہ ان لوگوں نے جس بے کسی کے عالم میں گزارا اس کی تصویر بہادر شاہ ظفر نے یوں کھینچی ہے: ؎

شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

اسی غربت کدہ میں بہادر شاہ نے ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ / ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو وفات پائی۔ زینت محل بیوہ ہو گئی مگر انگریزوں نے اس کی جلا وطنی برقرار رکھی۔ آخر چوبیس سال کے بعد ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں وہ بھی اسی غربت کدہ میں اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی اور اپنے شوہر کے پہلو میں سپردِ خاک کر دی گئی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً ستّر برس کی تھی۔

(مشاہیر نسواں، تاریخ ہند وغیرہ)

نواب حضرت محل

اودھ کے آخری نواب واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) کی دلی عہدی کا زمانہ تھا کہ امراؤ نام کی ایک لڑکی اس کے "پری خانے" میں داخل ہوئی۔ اس "پری خانہ" میں لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دی جاتی تھی اور آدابِ محفل سکھائے جاتے تھے۔ امراؤ نے جلد ہی نواب کے دل میں گھر کر لیا اور دسمبر ۱۸۴۸ء میں اس نے اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اس وقت وہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس نے امراؤ کو حضرت محل کا خطاب دیا۔ اس خطاب نے اتنی شہرت پائی کہ لوگ اس کا اصل نام ہی بھول گئے۔ کچھ مدت بعد حضرت محل کے بطن سے واجد علی شاہ کا ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مرزا رمضان علی برجیس قدر رکھا گیا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ جانِ عالم واجد علی شاہ ایک رنگین مزاج حکمران تھا اور اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کی بجائے اکثر رنگ رلیوں میں مشغول رہتا تھا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی رعایا میں بے حد ہر دلعزیز تھا اور شعر و ادب سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ مزاج اس کا بے شک رنگین تھا اور وہ کھیل تماشوں اور رقص و موسیقی کا بھی دلدادہ تھا لیکن انگریزوں نے اس کی عیاشیوں کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے صرف اس لیے کہ اودھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کرنے کا جواز پیش کیا جا سکے۔ بہرصورت اودھ کے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ انگریزوں کو دخل اندازی کا موقع مل گیا۔ انہوں نے فروری ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کو معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا اور اس کی قلمرو کو سلطنتِ برطانیہ میں شامل کر لیا۔ واجد علی شاہ اپنے

بہت سے حاشیہ نشینوں اور ملازموں کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گیا۔ البتہ کچھ متعلقین اور بیگمات کا قیام لکھنؤ ہی میں رہا۔ ان میں حضرت محل اور اس کا بیٹا مرزا برجیس قدر بھی شامل تھے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے جنگِ آزادی کا آغاز ہوا (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔) جلد ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ تیزی سے بھڑک اٹھی اور دُور دُور تک پھیل گئی۔ لکھنؤ میں ہندوستانی سپاہیوں کے باغی ہونے کی خبریں پہنچیں تو وہاں بھی ہل چل کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے ایک امیر آغا مرزا نے دو سو مجاہدوں کو ساتھ لے کر محمّدی جھنڈا بلند کیا لیکن ریذیڈنٹ کے حکم سے سب کو گرفتار کر لیا گیا اور آغا مرزا اور ان کے ۴۴ ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ کے امراء اور شاہی خاندان کے لوگوں کے ہتھیار ضبط کرنے کا حکم دیا، لوگوں کے جذبات پہلے ہی انگریزوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے اب ان میں سخت ہیجان پھیل گیا۔ آخر ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ میں مقیم اکثر ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور شہریوں کے ساتھ مل کر انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ انگریز چھاؤنی اور شہر خالی کر کے ریذیڈنسی میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اُدھر فیض آباد میں بھی ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور جیل خانے کو توڑ کر تحریکِ آزادی کے ایک نامور مجاہد مولوی احمد اللہ شاہ کو رہا کرا لیا۔ وہ بھی لکھنؤ پہنچ گئے۔ ۵ جولائی کو نواب شمشیر الدولہ بہادر کی تحریک اور نواب ممو جان اور بہت سے دوسرے بااثر امراء کی تائید سے خُرد سال مرزا رمضان علی برجیس قدر کو تختِ حکومت پر بٹھایا گیا اور حضرت محل کو اس کی سرپرست اور مختارِ کل مقرر کیا گیا۔ حضرت محل زمانے کے سرد و گرم دیکھ چکی تھی۔ اس نے شاہانہ زندگی بھی گزاری تھی اور اُس کس مپرسی سے بھی دوچار ہو چکی تھی جو نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد محلات پر گزری تھی۔ اس نے بیمثال

ہمت اور حوصلے سے نئی ذمہ داریوں کو سنبھالا اور عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی اودھ کے تعلقداروں اور زمینداروں کے نام یہ فرمان جاری کیا:

"ملک آبائی خدا نے اب ہم کو عطا کیا، دفع کفّار فرنگ لازم ہے باہم شریک ہو کر باقی ماندگان بیلی گارد (ریذیڈنسی) کو ٹھکانے لگا دو۔ جو یہ کام کرے گا اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہو گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے مرزا برجیس قدر کے نام کے سکے جاری کر دیئے اور ان پر یہ شعر کندہ کرائے۔

سکہ زد اندر جہاں چوں ماہ بدر　　شاہ رمضان علی برجیس قدر

—— دیگر ——

سکہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر　　نیرِ دین میرزا برجیس قدر

—— دیگر ——

بزد سکہ در دہر چوں مہر بدر　　ابوالحرب قاآن برجیس قدر

—— دیگر ——

سکہ زد از فضلِ حق بر اشرفی مہر بدر　　اخترِ سلطانِ عالم میرزا برجیس قدر

ملک کے انتظام کے لیے حضرت محل نے ایک انقلابی کونسل قائم کی جس کے اراکین میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی شامل تھے۔ ان میں شرف الدولہ کی حیثیت وزیرِ اعظم کے برابر تھی۔ مہاراجہ بالکشن وزیر مالیہ، مموجان صدرِ عدالت اور راجہ جے لال سنگھ وزیرِ جنگ تھے۔ مولوی احمد اللہ شاہ حضرت محل کے مشیرِ خاص تھے اور وہ انقلابی کونسل کے اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔

اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی سارے اودھ میں بغاوت پھیل گئی اور لوگ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے پر تل گئے۔ خان بہادر منشی ذکاء اللہ مرحوم نے تاریخِ ہند میں لکھا ہے کہ:

"صرف گیارہ دن میں اودھ کے کسی ضلع میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے کوئی حاکم نہ تھا اور انگریزی عملداری خواب معلوم ہوتی تھی۔"

حضرت محل کا قیام جس عمارت میں تھا اس کا نام چولکھی تھا وہیں انقلابی کونسل کے اجلاس ہوتے تھے۔ حضرت محل خود گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی۔ ۳۱ جولائی کو بیلی گارد پر پہلا حملہ مولوی احمد اللہ شاہ کی قیادت میں ہوا۔ حملے کے دن حضرت محل رات بھر انتظامات میں مصروف رہی اور ایک پل کے لیے بھی نہ سوئی۔ انگریز قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے اور انہوں نے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اس لیے بیلی گارد پر قبضہ نہ ہو سکا مگر حضرت محل نے اپنی فوج کی ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

اسی طرح جب عالم باغ کی لڑائی میں راجہ مان سنگھ نے سر دھڑ کی بازی لگا کر انگریزوں کو لوہے کے چنے چبوا دیئے تو حضرت محل نے اس کو "فرزند خاص" کا خطاب دیا اور خلعت دوشالہ اور رومال کے علاوہ ملبوس خاص بھی عنایت کیا۔ دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد جنرل بخت خاں، فیروز شاہ اور نانا راؤ بھی لکھنؤ آ گئے اور حضرت محل کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی، اب لکھنؤ ہی جنگ آزادی کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ منشی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

"ستر اسی ہزار آدمی، بہادری، استقلال اور ہوشیاری سے اپنے مستحکم مقام کو استوار کر رہے تھے جن کو قومی عزت اور مذہبی دیوانگی نے جواں مرد عورت حضرت محل نائب السلطنت کے علموں کے نیچے شہر میں جمع کیا تھا۔"

حضرت محل بڑی غیور، باتدبیر، اور نڈر خاتون تھی۔ وہ پردے کی پابند تھی لیکن محض فوج کا دل بڑھانے کی خاطر گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پاس جایا کرتی تھی۔ ایک لڑائی میں بخت خاں کی توپیں چھن گئیں تو وہ سخت پریشان ہو گیا،

حضرت محل نے اس سے ملاقات کی اور کہا، تم توپوں کے چھن جانے کا غم نہ کرو میں تمہیں اور توپیں دے دوں گی۔

اس وقت انگریزوں کی حالت بہت نازک تھی لیکن دلی کی طرح لکھنؤ میں بھی بعض غداران وطن نے ان کی اعانت کی اور ریذیڈنسی پر حضرت محل کا قبضہ نہ ہو سکا۔ اسی اثناء میں سر کولن کیمپ بل بہت بھاری فوج لے کر لکھنؤ پہنچ گیا۔ حضرت محل کی فوج نے اس کی زبردست مزاحمت کی لکھنؤ کے گلی کوچوں میں خونریز معرکے ہوئے لیکن انگریزی فوج مورچے پر مورچہ فتح کرتے آگے ہی بڑھتی گئی اور حضرت محل کی قیام گاہ چولکھی تک پہنچ گئی۔ یہاں غضب کا رن پڑا اور سینکڑوں ہندوستانیوں نے چولکھی کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ قریب تھا کہ چولکھی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جائے، خان علی خان ایک ہزار سرفروشوں کے ساتھ حضرت محل کی مدد کو پہنچ گیا۔ ان بہادروں نے وقتی طور پر تو انگریزی فوج کو پیچھے دھکیل دیا لیکن اب بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہی تھی کیونکہ باقی سارے لکھنؤ پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ ناچار حضرت محل چولکھی کو خالی کر کے ترکِ وطن پر مجبور ہو گئیں۔ مولوی احمد اللہ شاہ اس سے پہلے ہی دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے لکھنؤ سے باہر نکل گئے۔ حضرت محل کی چولکھی سے روانگی کا منظر صاحب "قیصر التواریخ" نے یوں کھینچا ہے:

"حضرت محل بحالِ تباہ مع دیگر بیگمات اور شاگرد پیشہ عورات ملازمین پھاٹک سے نکلیں اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب پیچھے صف بستہ۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور الجھتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ جلیل سے نکل کر پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ رات کو غلام رضا کے یہاں قیام کیا پھر وہاں سے اشرف الدولہ کے گھر گئیں، وہاں سے محل سرائے حسین آباد آ گئیں۔ شام تک

جتنا عملہ شاگرد پیشہ تھا سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے ہوئے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اوٹرم کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانہ واجد علی شاہ کا بدستور تم کو تمہارا ملک دیں گے جنگ سے دست بردار ہو جائیے فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اوٹرم کی اس پیشکش کو نہایت حقارت سے ٹھکرا کر صلح نامہ پر دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔"

۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء کو حضرت محل نے سرزمینِ لکھنؤ کو خیرباد کہا لیکن ہمت نہیں ہاری، نئی فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ پرانے ساتھی بھی آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ اس کے پاس چھ ہزار مسلح سرفروشوں کا لشکر جمع ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس کو اطلاع ملی کہ مولوی احمد اللہ شاہ نے شاہجہانپور کا محاصرہ کر رکھا ہے اور ان کو مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً اپنی فوج لے کر ان کی فوج سے جا ملی لیکن انگریز کا نصیبہ یاور تھا اس کو فتح ہوئی اور حضرت محل نے چوکا گھاٹ میں جا پڑاؤ ڈالا۔ وہاں سے آگے بڑھی تو بہرائچ (یا بروایتِ دیگر بونڈی) میں لارڈ کلائیڈ نے مزاحمت کی۔ اس سے خونریز لڑائی کے بعد وہ نیپال میں داخل ہو گئی جس کی سرحد قریب ہی تھی۔ مہاراجہ نیپال نے حضرت محل اور اس کے بیٹے برجیس قدر کو تو پناہ دے دی لیکن اس کے باقی تمام ساتھیوں کو گرفتار کرا دیا یا اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔ ان میں نواب ممّو خان بھی شامل تھے۔ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے پہلے پھانسی کی سزا سنائی مگر بعد میں کالے پانی بھیج دیا۔ انہوں نے وہیں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

حضرت محل اب نیپال کے پہاڑی علاقے میں بالاستقلال مقیم ہو گئی۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہندوستان واپس آ جائے لیکن وہ اس پر رضامند نہ ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں نے اس کو یہ پیغام بھی بھیجا کہ اگر وہ اور برجیس قدر ہندوستان واپس آ جائیں تو لکھنؤ یا فیض آباد جہاں وہ چاہیں

ان کو رہنے کی اجازت ہوگی اور معقول وظیفے کے علاوہ احترام شاہانہ کا خیال بھی رکھا جائے گا لیکن حضرت محل نے یہ تجویز یلائے استحقار سے ٹھکرا دی، نہ خود آئی اور نہ برجیس قدر کو آنے دیا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت محل نے نیپال ہی میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد مرزا برجیس قدر کلکتہ چلا گیا وہیں ایک دعوت میں کسی نے زہر دے دیا اور وہ اپنی بیگم اور کمسن بیٹے کے ساتھ راہئ ملکِ بقا ہوا۔

نواب حضرت محل کے بارے میں بعض لوگوں میں یہ کہانی بھی مشہور ہے کہ وہ کسی وقت نہایت راز داری کے ساتھ نیپال سے نکلی اور پر صعوبت سفر کے بعد عراق پہنچ گئی، وہاں اس نے کربلا، نجفِ اشرف اور دوسرے کئی مقدس مقامات کی زیارت کی پھر ایران پہنچی اور وہیں وفات پائی۔

(واللہ اعلم بالصواب)

(۱۸۵۷ء کے مجاہد۔ سن ستاون میری نظر میں،

لیل و نہار لاہور ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء، آج کل دہلی جولائی ۱۹۵۹ء،

گنج شائگاں)

عزیز النّساء بیگم

برِّ کوچک پاک و ہند کی نامور شخصیت سر سید احمد خان (المتوفّی ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء) کی والدہ تھیں۔ والد کا نام نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد تھا۔ جو بہادر شاہی دربار کے ایک نہایت معزّز رکن تھے۔ شوہر کا نام میر تقی تھا۔ اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ اگرچہ صرف قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھی ہوئی تھیں لیکن نہایت ذہین، روشن دماغ، دانش مند سلیقہ شعار، رحمدل، با اخلاق اور نیک سرشت بی بی تھیں۔ انہوں نے اپنے بچّوں کی تربیت بھی نہایت عمدگی سے کی اور ہمیشہ یہ مقصد پیش نظر رکھا کہ وہ بڑے ہوکر نیک اور سچے مسلمان بنیں۔ سر سید احمد خاں کو اپنے بچپن کے واقعات خوب یاد تھے وہ بتایا کرتے تھے کہ فارسی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنی والدہ سے حاصل کی، انہوں نے مجھے گلستاں اور فارسی کی اکثر دوسری ابتدائی کتابیں پڑھائیں — جب میں ان کو سبق سنانے بیٹھتا یا ان سے نیا سبق لیتا تو وہ سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیاں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی میری تنبیہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیتیں اگرچہ وہ خفا تو کئی بار ہوئی ہوں گی مگر ان لڑیوں سے مجھے کبھی مار نہیں پڑی۔ والدہ نے بچپن میں مجھے بہت سے مفید اور اخلاقی سبق دیئے جو اب تک میرے ذہن پر نقش ہیں۔ اپنے بچپن کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"جس زمانے میں میری عمر گیارہ بارہ برس کی تھی، میں نے ایک نوکر کو جو بہت بڈھا اور پرانا تھا کسی بات پر تھپڑ مارا، جس وقت میری والدہ کو خبر ہوئی اور تھوڑی دیر بعد میں گھر میں گیا تو

میری والدہ نے ناراض ہو کر کہا کہ اس کو نکال دو جہاں اس کا جی چاہے چلا جائے، یہ گھر میں رہنے کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ ایک ماما میرا ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر لے گئی اور باہر سڑک پر چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک دوسری ماما میری خالہ کے گھر سے جو قریب تھا، نکلی اور مجھ کو میری خالہ کے گھر لے گئی۔ میری خالہ نے کہا، دیکھو تمہاری والدہ تم سے کس قدر ناراض ہیں اور اس سبب سے جو تم کو گھر میں رکھے گا اس سے بھی خفا ہوں گی مگر تم کو میں چھپائے رکھتی ہوں اور کوٹھے پر کے ایک مکان میں چھپا دیا۔ تین دن میں اس کوٹھے پر چھپا رہا۔ میری خالہ میرے سامنے نوکروں اور بہنوں سے کہتی تھیں کہ "دیکھنا آپا جی کو خبر نہ ہو کہ یہاں چھپے ہوئے ہیں۔" تین دن کے بعد میری خالہ میری والدہ کے پاس قصور معاف کرانے کے واسطے لے گئیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر اس نوکر سے قصور معاف کرائے تو میں معاف کر دوں گی اور نوکر ڈیوڑھی میں بلایا گیا۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے جب تقصیر معاف ہوئی۔"

عزیز النساء بیگم کے بچے جوان ہو گئے تب بھی انہوں نے ہمیشہ ان کے اخلاق اور کردار پر نظر رکھی۔ اگر ان کے طرز عمل میں کوئی خامی دیکھتیں تو اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتیں اور وقتاً فوقتاً ان کو اچھی اچھی نصیحتیں کرتی رہتیں۔

سرسید کا اپنے ایک دوست سے بہت میل جول تھا اور دونوں ایک دوسرے کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ دوست ناراض ہو گئے اور سرسید کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ سرسید کچھ عرصہ تو ان کے ہاں جاتے رہے لیکن پھر انہوں نے بھی جانا چھوڑ دیا۔ ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس کا سبب پوچھا، سرسید نے واقعہ عرض کیا تو انہوں نے کہا:

"نہایت افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے وہی بات تم بھی

کرتے ہو۔ جب دوستی ہے تو اسے پورا کرنا چاہیے یہ تمہارا فرض ہے اور....
اس دوستی کا پورا برتاؤ کرنا اس کا فرض ہے۔ تم دوسرے شخص کے فرض ادا کرنے کے ذمہ دار کیوں ہوتے ہو۔ تم کو بدستور اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اس سے تم کو کیا کہ دوسرا ابھی اپنا فرض ادا کرتا ہے یا نہیں۔"

ایک دفعہ ایک ایسا شخص جس پر کبھی سرسید نے بہت احسان کیا تھا، اس نے محسن کشی کرتے ہوئے نیکی کا بدلہ بدی سے دیا۔ اتفاق سے وہ تمام ثبوت سرسید کے ہاتھ آ گئے جو اس کو عدالت سے سخت سزا دلا سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا۔ ان کی والدہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو بلا کر کہا۔ "بیٹے اگر تم اس کو معاف کر دو تو اس سے اچھا کوئی کام نہیں۔ اگر تم اس کو اس کی بداعمالی کی سزا حاکم سے دلوانا چاہتے ہو تو بڑی نادانی کی بات ہے۔ آخر تم اس کو ہر نیکی بدی کا بدلہ دینے والے احکم الحاکمین کی گرفت سے چھڑا کر دنیا کے ضعیف حاکموں کے پنجے میں کیوں دینا چاہتے ہو؟"

سرسید کہتے ہیں کہ والدہ کی اس نصیحت نے میرے دل پر بڑا اثر کیا اور میں نے اس شخص سے انتقام لینے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس کے بعد بھی کسی شخص سے بدلہ لینے کا خیال کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا اگرچہ اس نے میرے ساتھ کیسی ہی برائی کیوں نہ کی ہو۔

عزیز النساء بیگم کی فراست اور دور اندیشی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی ان کے والد نواب دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین نے وزارت سے استعفا دیا تو کچھ عرصے کے بعد پنجاب کے حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور سے اپنے ایک معتمد کو تیس ہزار روپے دے کر ان کے پاس دلی بھیجا کہ یہ رقم سفر خرچ کے طور پر قبول کریں اور لاہور آ کر اس (مہاراجہ) کے دربار سے وابستہ ہو جائیں۔ خواجہ صاحب کے تمام احباب اور اعزہ و اقارب کی خواہش

تھی کہ وہ مہاراجہ کی پیش کش کو قبول کر لیں۔ خود خواجہ صاحب بھی اس پر رضا مند تھے لیکن جب انہوں نے بڑی بیٹی (عزیز النساء بیگم) سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس کے خلاف رائے دی اور کہا کہ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے جس سے آپ باقی ماندہ زندگی نہایت آرام اور راحت کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ یہ بات خلافِ مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ آپ لاہور جا کر رنجیت سنگھ کی حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لیں اور ہم سب انگریزی عملداری میں رہیں۔ معلوم نہیں کل کو حالات کیا صورت اختیار کریں اس لیے مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ آپ انگریزی عملداری کو چھوڑ کر لاہور چلے جائیں۔ دوسرے یہ کہ آپ کے بڑھاپے کا زمانہ ہے اور آپ کی طبیعت بھی ناساز رہتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپ یہیں رہیں۔ خواجہ صاحب کے دل پر دانا بیٹی کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے مہاراجہ کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر دی اور سفر خرچ واپس بھیج دیا۔

عزیز النساء بیگم بہت رحمدل تھیں۔ جب کسی غریب کو مصیبت میں دیکھتیں تو ہر طریقے سے اس کی مدد کرتیں۔ انہوں نے اپنے مکان کا ایک حصہ غریب اور بے سہارا عورتوں کے رہنے سہنے اور علاج کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک مسکین اور لاوارث بڑھیا زیبن تھی جو آخری وقت تک ان کے ساتھ رہی۔ ایک دفعہ اتفاق سے عزیز النساء بیگم اور زیبن ایک ہی زمانے میں بیمار ہو گئیں۔ طبیب جو دوا بیگم صاحب کے لیے تجویز کرتا وہی دوا وہ زیبن کو بھی استعمال کراتی تھیں۔ جلد ہی خدا نے دونوں کو صحت یاب کر دیا۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے طاقت کی بحالی کے لیے ایک قیمتی معجون عزیز النساء بیگم کے لیے تجویز کی۔ انہوں نے در پردہ یہ معجون زیبن کو کھلا دی اور خود اسے چکھا تک نہیں۔ چند دن بعد جب سید صاحب نے والدہ سے کہا کہ "اس معجون سے تو آپ کو بہت فائدہ پہنچا" تو انہوں نے ہنس کر کہا، کیا تمہارے

خیال میں اللہ تعالیٰ دوا کے بغیر صحت نہیں دیتا ؟ سید صاحب یہ سن کر حیران ہوئے اور سارا قصہ معلوم ہوا۔

عزیز النساء بیگم کا دست سخاوت بہت کشادہ تھا لیکن وہ کسی مقصد کے لیے منت یا نیاز نہیں مانتی تھیں اور نہ تعویذ گنڈوں وغیرہ پر ان کا اعتقاد تھا۔ سید صاحب کا بیان ہے کہ "میرے ننھیال والوں کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان سے بہت عقیدت تھی۔ شاہ صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ لڑکوں کو بعض بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک گنڈا دیا کرتے تھے جس میں ایک تعویذ ہوتا تھا۔ اس تعویذ میں ایک حرف یا ہندسہ سفید مرغ کے خون سے لکھا جاتا تھا اور جس لڑکے کو پہنایا جاتا اس کو بارہ برس کی عمر تک انڈا یا مرغی کا گوشت کھانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ سید حامد اور سید محمود میرے دونوں بیٹوں کو بھی ان کی ننھیال والوں نے وہ گنڈا پہنایا مگر میری والدہ کو یہ خیال تھا کہ اس گنڈے کے سبب سے انڈا یا مرغی نہ کھانا اور یہ سمجھنا کہ اگر کھائیں گے تو کوئی آفت آئے گی خدا پر ایمان رکھنے کے برخلاف ہے۔ وہ دونوں لڑکوں کو جب کبھی وہ ان کے ساتھ کھاتے اور کوئی ایسی چیز بھی موجود ہوتی جس میں انڈا پڑا ہو یا مرغی کا سالن یا مرغ پلاؤ ہوتا تو بے تامل ان کو کھلا دیتیں۔"

۱۸۵۷ء میں دلی میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو سید صاحب بجنور میں صدر امین تھے لیکن ان کی والدہ اور ایک نابینا خالہ اپنے گھر دلی میں تھیں۔ جب انگریزوں نے دلی دوبارہ فتح کی تو انگریز سپاہی گھروں میں گھس آئے اور لوگوں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ عزیز النساء بیگم کا گھر بھی لٹ گیا اور وہ اپنی بہن کو لے کر زینبُن کی کوٹھڑی میں چلی گئیں اور آٹھ دس روز سخت مصیبت میں گزارے۔ سید صاحب نے اس مصیبت کا حال اس طرح بیان کیا ہے:۔

"اس عرصے میں میں میرٹھ آ گیا تھا۔ میرٹھ سے دہلی پہنچا اور اپنی

والدہ کے پاس گیا۔ اس وقت تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ گھوڑے کا دانہ کچھ مل گیا اسی پر بسر کی تھی۔ دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پانی کی نہایت تکلیف تھی۔ میں نے کوٹھڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ پہلا لفظ جو ان کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "ہیں! تم یہاں کیوں آ گئے یہاں تو لوگوں کو مارے ڈالتے ہیں، تم چلے جاؤ، ہم پر جو گزرے گی، گزرے گی۔" میں نے کہا، آپ خاطر جمع رکھیے مجھے کوئی نہیں مارے گا میرے پاس سب حاکموں کی چٹھیاں ہیں اور میں ابھی قلعے سے انگریزوں اور دہلی کے گورنر سے مل کر آیا ہوں۔ ان کی طمانیت ہوئی اور معلوم ہوا کہ دو دن سے مطلق پانی نہیں پیا ہے۔ میں پانی کی تلاش کو نکلا۔ پانی اس طرف کہیں نہیں ملا۔ ناچار پھر قلعے میں گیا اور وہاں سے ایک صراحی پانی کی لے کر چلا۔ جب اپنے گھر کے قریب بازار میں پہنچا تو دیکھا کہ وہی لاوارث بڑھیا سڑک پر بیٹھی ہے اور اس کے ہاتھ میں مٹی کی صراحی اور آبخورہ ہے۔ اور کسی قدر بدحواس ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ پانی کی تلاش کو نکلی تھی، تھوڑی دور چل کر بیٹھ گئی اور پھر اٹھا نہ گیا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ بھی پیاسی ہے دو دن سے پانی نہیں ملا۔ میں نے اس کے آبخورہ میں پانی دیا اور کہا "پانی پی لے" اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے آبخورے کا پانی صراحی میں ڈالا اور کچھ گرا دیا اور گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ بیگم صاحب پیاسی ہیں ان کے لیے پانی لے جاؤں گی، اور اسی غرض سے پانی صراحی میں ڈالتی تھی۔ میں نے کہا، میرے پاس پانی بہت ہے میں لے آیا ہوں تو پانی پی لے۔ پھر آبخورے میں پانی دیا۔ اس نے پیا اور لیٹ گئی۔

میں جلدی جلدی گھر کی طرف آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو تھوڑا تھوڑا پانی پینے کو دیا۔ انہوں نے خدا کا شکر کیا۔ اب میں گھر سے نکلا کہ سواری کا بند و بست کر کے ان کو میرٹھ لے جاؤں۔ جب اس مقام پر پہنچا جہاں بڑھیا زمین پر لیٹی ہوئی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکی ہے۔ سارے شہر میں باوجودیکہ حکام نے بھی احکام جاری کیے لیکن کہیں سواری نہ ملی۔ آخر کار حکام قلعہ نے اجازت دی کہ شکرم جو سرکاری ڈاک میرٹھ کو لے جاتی ہے مجھ کو دے دی جائے میں وہ شکرم لے کر گھر پر آیا اور اپنی والدہ اور خالہ کو اس میں بٹھا کر میرٹھ لے آیا۔"

میرٹھ پہنچ کر عزیز النساء بیگم بیمار ہو گئیں۔ ایام علالت میں ان کی بیٹی نواسیاں، پوتے پوتیاں اور بہوئیں جو مختلف مقامات کو چلے گئے تھے سب میرٹھ پہنچ گئے اور انہوں نے سب کو صحیح سالم دیکھ لیا۔ لیکن وقتِ آخر آ پہنچا تھا زیادہ دن نہ جیئیں اور سید صاحب کو ضروری وصیتیں کر کے میرٹھ ہی میں فوت ہو گئیں۔

سید صاحب کا بیان ہے کہ میری والدہ کی نصیحتیں نہایت حکیمانہ ہوتی تھیں مثلاً وہ کہتی تھیں کہ مصیبتیں جو انسانوں پر پڑتی ہیں اس میں کچھ خدا کی حکمت ہوتی ہے مگر بندے اس حکمت کو نہیں سمجھ سکتے۔

⊙ اگر کسی نے تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر برائی کرے یا دو دفعہ نیکی کی ہو اور دو دفعہ برائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایک یا دو دفعہ کی نیکی کرنے والا کیسی ہی برائی کرے اس کی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔

⊙ جہاں جہاں تم جانا لازمی سمجھتے ہو اور ہر حالت میں تم کو وہاں جانا لازمی ہوگا تو تم وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا۔ زمانے کا کچھ اعتبار نہیں ہے کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ پس ایسی عادت رکھو کہ ہر حالت میں اس کو نباہ سکو۔

(العلم کراچی اپریل تا جون بسنہ ۱۹۶۸ء)

نواب اختر محل اختؔر

تیموری (مغلیہ) خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ اردو کی نغزگو شاعرہ تھی۔ ۱۲۸۰ھ میں دلّی اور اس کے گرد و نواح میں اس کی شاعری کا عام چرچا تھا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

تیغِ نگاہِ یار کا دونو پہ وار ہے ٹکڑے اِدھر جگر ہے اُدھر دل نگار ہے

آستاں پر ترے پیشانی کو گھستے گھستے سر ہی غائب ہوا جس میں کہ ترا سودا تھا

اک آہِ شعلہ بار نے دل کو جلا دیا	لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا
لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا	اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیا	غیروں نے آج ان کے تئیں کچھ پڑھا دیا
تقصیر یار کی نہ قصورِ عدو ہے کچھ	اختؔر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

اختر محل اختؔر نے قدسی کی مشہور نعت پر ایک خمسہ بھی لکھا ہے۔ یہ خمسہ اختؔر کی حُبِّ رسول ؐ کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

تجھ پہ قربان ہوں اے ہاشمی و مُطّلبی	کہ ہے مشہورِ دو عالم تری عالی نسبی
دیکھ رتبہ کو ترے شوکتِ افلاک دبی	مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی

دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی!

وہ ترا نور ہے ماہِ فلک و مہر کرم	تیرے جلوہ سے منوّر ہوئے دونو عالم
تاب یوسف کو کہاں کہ ترے دیکھے قدم	مِن بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بو العجبی!

واہ کیا درجہ ہے کیا شان ہے اور کیا رتبہ | خالقِ ارض و سما خود ہے ترا مدح سرا
انبیاء سب کہتے ہیں صَلِّ عَلیٰ صَلِّ عَلیٰ | نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از آدم و عالم تو چہ عالی نسبی

تو ہے نیسانِ کرم اور سحابِ اکرام | بھر دیا موتیوں سے دامنِ امیدِ انام
بارآور ترے باعث سے ہے نخلِ اسلام | نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سر سبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

سب سے پہلے کیا پیدا ترا اللہ نے نور | پردۂ ذات میں رکھا اس نور کو مستور
اور اس نور کا اظہار ہوا جب منظور | ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کردہ ظہور

زاں سبب آمدہ قرآن بزبانِ عربی

ہے ترے نور سے پُر نور زمیں دشت بدشت | گلشنِ چرخ ہے تیرے ہی برائے گلگشت
تیرے ہی واسطے ہیں خاص یہ جہات ہشت | شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت

بمقامے کہ رسیدی نرسید ہیچ نبی!

قدسیاں آنکھیں بچھاتے ہیں ترے زیرِ قدم | خاکِ پا تیری نبی سرمۂ چشمِ عالم
بخش دیجو مری تقصیر اے شاہِ اُمَم | نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم

زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

سختیٔ حشر سے گھبرائے گی جب مخلوقات | اور نہ بن آئے گی اے ابرِ کرم کوئی بھی بات
انبیاء سب تجھے کہوینگے کہ اے ابرِ نجات | ماہمہ تشنہ لبانیم تُوئی آبِ حیات

لطف فرما کہ حدمی گزرد تشنہ لبی

ہوگئی لہو و لعب میں ہی مری عمر بسر | یادِ خالق میں نہ مصروف ہوئی میں دم بھر
گھستی ہوں ناصیۂ عجز کو تیرے در پر | چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر

اے قریشی لقب و ہاشمی و مُطّلبی

دردِ عصیاں کے سبب سے ہے مری جان پہ چلی | اور بچنے کی نہیں سوجھتی تدبیر کوئی
عرض اختر کی بھی قدسی کی طرح سے ہے یہی | سیدی اَنتَ حبیبی و طبیبِ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

بی بی لیلیٰ خانم

تیرھویں صدی ہجری میں ترکی کی نامور شاعرہ ہوئی ہے۔ بعض نے اس کو ترکی کے قدیم طرزِ سخن کی سب سے بڑی شاعرہ لکھا ہے اور بعض اس کا شمار ان شاعروں میں کرتے ہیں جنہوں نے ترکی نظم سے ثقیل اور پُر تصنّع الفاظ نکال کر اس کو نئے راستے پر ڈالا اور اس کی موجودہ صورت پیدا کی۔ وہ قاضی عسکر مُرل زادہ حامد آفندی کی بیٹی تھی۔ قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی اور اعلیٰ تعلیم پائی۔ اس عہد کا ملک الشعراء عزت مُلّا (عزت مولیٰ) اس کا حقیقی (یا رشتے کا) بھائی تھا۔ شعر و شاعری میں وہ اسی کی شاگرد تھی۔ جب وہ فوت ہوا تو لیلیٰ خانم نے اس کا نہایت دردناک مرثیہ لکھا۔ لیلیٰ خانم بےحد ذہین و فطین تھی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی —— اس کی شادی کم سنی میں ہو گئی لیکن ایسے جلد ہی طلاق مل گئی۔ اس حادثے نے اس کو بہت متاثر کیا اور وہ اپنا بیشتر وقت فکرِ سخن میں گزارنے لگی۔

زندگی کے آخری دَور میں اس کا رجحان تصوّف کی طرف ہو گیا اور وہ مولانا رومؒ کے عقیدت مند مولویہ درویشوں میں شامل ہو گئی۔ اس نے ۱۲۶۴ھ میں وفات پائی اور غلطہ کی خانقاہ مولویہ میں دفن ہوئی۔ ۱۸۴۸ء

ترکی کا مشہور مدبّر اور مصلح فواد پاشا لیلیٰ خانم کا بھتیجا تھا۔

لیلیٰ خانم کا دیوان کئی بار طبع ہو چکا ہے۔ اس کا بیشتر کلام تغزّل کے رنگ میں ہے۔ اس کی مناجاتوں اور مرثیوں کو ملک میں حد سے زیادہ مقبولیّت حاصل ہوئی۔ جو لوگ روایتی مشرقی شاعری کے دلدادہ ہیں وہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی اس کا کلام پسند کرتے ہیں۔

(مشاہیر نسواں۔ مشاہیر النساء۔ سٹینلے لین پول۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۸)

بی بی مہ لقا بائی چنداؔ

چنداؔ بارھویں/تیرھویں صدی ہجری کی ایک باکمال خاتون ہوئی ہے ــــ والد کا نام مرزا سلطان تھا جو بلخ کا رہنے والا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط میں ترکِ وطن کر کے ہندوستان آیا۔ یہ احمد شاہ (۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ) کا زمانہ تھا۔ مرزا سلطان نے شاہی دربار میں ملازمت اختیار کر لی اور بعض کارہائے نمایاں کے صلے میں بادشاہ سے صلابت خان کا خطاب پایا۔ شاہ عالم (۱۱۷۳ھ تا ۱۲۰۲ھ) کے دور میں اس کا مرتبہ اور بھی بڑھ گیا۔ بادشاہ نے اسے شاہی افواج کا بخشی مقرر کیا اور بسالت خان کا خطاب دیا۔

چنداؔ مرزا سلطان کی اہلیہ راج کنور بائی (دختر محمد حسین خان کاٹھیاواڑی) کے بطن سے ۱۱۸۰ھ میں پیدا ہوئی۔ اصل نام ماہ لقا بائی تھا۔ والد نے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا اور اس کو اُس دَور کے جید علماء اور اہلِ کمال سے تعلیم دلائی۔ وہ طبعاً بڑی ذہین اور علم کی شائق تھی۔ بہت جلد مختلف علوم و فنون میں طاق ہو گئی اور اس کے علم و ہنر کے چرچے ہر طرف پھیل گئے۔ وہ نہ صرف ایک متبحر عالمہ اور بلند پایہ شاعرہ تھی بلکہ گھڑ سواری، تیر اندازی اور شمشیر زنی وغیرہ میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بے حساب مال و دولت سے نوازا تھا۔ کہیں جاتی تو اردل میں پانچ سو سپاہی ہوتے تھے۔

جب دِلی میں حالات سازگار نہ رہے تو وہ حیدرآباد دکن چلی گئی جہاں نظامِ دکن آصف جاہ ثانی نے بکمال مہربانی اس کی پذیرائی کی اور وہ ریاست کے دیوان (وزیرِ اعظم) راجہ راؤ منیا کی ملازمت میں داخل ہو گئی (غالباً اس میں

نظام کا ایماء بھی شامل تھا) چنداؔ علم دوست بھی تھی اور اہل علم کی قدردان بھی۔ چنانچہ اس کی فرمائش پر جناب غلام حسین جوہرؔ نے سلطنتِ آصفیہ کی تاریخ "تاریخ دل افروز" لکھی۔ بی بی چنداؔ نے جوہرؔ کی ہر طریقے سے سرپرستی کی اور کتاب کی تکمیل پر ان کو بیش بہا انعام سے نوازا۔

شعروشاعری میں بی بی چنداؔ شیر محمد خان ایمانؔ سے اصلاح لیتی تھی وہ اپنی حویلی میں اکثر مشاعروں کا انتظام کرتی جن میں اونچے درجے کے شعراء اور ادیب شریک ہوتے۔ کبھی کبھی وہ محافلِ موسیقی بھی منعقد کرتی جن میں دکن کے اونچے درجے کے امراء شریک ہوتے۔ چنداؔ کے یومیہ معمولات یہ تھے:

"علی الصّباح بیدار ہو کر نمازِ فجر ادا کرتی۔ طلوعِ آفتاب تک ادعیۂ ماثورہ اور وظائف و اوراد میں مشغول رہتی۔ اس کے بعد قرآنِ پاک کی تلاوت کرتی، پھر ناشتہ کرتی۔ دوپہر کو قیلولہ کے لیے بالاخانے میں چلی جاتی اور آرام کرتی یہاں تک کہ نمازِ ظہر کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ ظہر سے فارغ ہو کر تسبیح و تہلیل میں مشغول ہو جاتی یہاں تک کہ عصر کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ عصر پڑھ کر دیوان خانے میں بیٹھ جاتی اور ملازموں کو امورِ خانہ داری اور خانگی حساب کتاب کے بارے میں ہدایات دیتی۔ اس کے بعد عُلَماء فُضَلاء اور شعراء سے علمی گفتگو ہوتی۔ چنداؔ کو مطالعۂ کتب کا بھی بہت شوق تھا "حبیب السِّیَر" اور "روضۃ الصفا" اس کی محبوب کتابیں تھیں اکثر ان کا مطالعہ کرتی رہتی۔ ان کے علاوہ فارسی اور ریختہ کے دیوان بھی باقاعدگی سے پڑھتی۔ یہ سلسلہ نمازِ مغرب تک جاری رہتا۔ نمازِ مغرب کے بعد کھانا ہوتا۔ پھر کچھ وقفہ ہوتا یہاں تک کہ نمازِ عشاء کا وقت ہو جاتا۔ نمازِ عشاء کے بعد فنِ موسیقی کے استادوں کی محفل جمتی جو نصف شب تک جاری رہتی۔ رمضان المبارک میں روزے

کے بجائے روزانہ کھانے کے ایک سو بیس خوان غریبوں مسکینوں کو دیا کرتی تھی۔ "

ایک مرتبہ راجہ راؤ منیا نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ چندا کی اردو غزلیات کا دیوان مرتب کیا جائے۔ چنانچہ سید نصیر الدین خان قدرت نے یہ دیوان مرتب کیا اور چندا کی خواہش پر اس کا دیباچہ بھی لکھا جو فارسی زبان میں ہے۔ اس میں قدرت نے چندا کے کمالِ فن اور کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ جب دیوان مرتب ہو گیا تو اس وقت راجہ راؤ منیا کی جگہ نواب ارسطو جاہ سلطنتِ آصفیہ کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو چکے تھے۔ انہوں نے اس دیوان کو پسند فرمایا۔ اس کی تاریخ

هُوَ اللَّطِيفُ الْأَعْظَم

یعنی ۱۲۱۳ھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چندا اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہے۔ اردو کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کہاں طاقت کہ راہِ حمد میں ہو زباں گویا | کہ یاں جز عجز و خاموشی نہیں ہے یک زباں گویا
سوائے حق کے کب کوئی واصفِ وصفِ اتم ہو | رہا چندا ملک پر بھی ہے نکتہ نہاں گویا

اخلاق سے اپنے واقف جہاں ہیگا | پر آپ کو غلط کچھ اب تک گماں ہیگا
اک سخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینہ کو | پر کیا کروں کہ تیرا منہ درمیاں ہیگا

ساقی دے مجھ کو جامِ مئے ارغواں پھر | افسردہ دل میں آئے جو شعلہ سی جاں پھر

ملتے ہیں توقع یہ تری غیر سے کم ہم | رکھتے ہیں ترے دَر میں یہ چشمِ کرم ہم

چشم کافر بھی ہے اور غمزہ خونخوار بھی ہے | قتل کو پاس سپاہی کے یہ تلوار بھی ہے

اس دیوان کا ایک مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں موجود ہے اس کا ایک اور مخطوطہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بی بی چندا نے اپنے اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۹ء میں کسی انگریز کو دے دیا تھا۔ اس نے یہ نسخہ انڈیا آفس لائبریری (لندن) کو دے دیا۔

چندا فارسی زبان میں بھی مشقِ سخن کرتی تھی۔ اس کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

بروزِ حشر الٰہی چو نامۂ عملم | کنند باز کہ آں روز باز خواہ منست
بکُن مقابلہ آں را بسر نوشتِ ازل | کمی و بیشی اگر باشد آں گناہِ منست

گرانی مے کند بارِ تبسم لعلِ جاناں را | کہ آں لب از نزاکت بر ندارد سرخیٔ پاں را

چندا جود و سخا میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ ایک دفعہ اس نے ایک مسجد تعمیر کرائی تو ایک شاعر نے اس کی تاریخ کہی ؎

چو محرابش سجودِ خاص و عام است!
فلک گفتا کہ ایں بیت الحرام است!

چندا یہ سن کر خوب ہنسی اور ایک ہزار روپے کا انعام اسے دیا۔
چندا نے نواب نظام علی خان بن نظام الملک کے عہد میں کسی وقت انتقال کیا۔ اگرچہ زندگی میں اس کا دستِ سخاوت بہت کشادہ رہا۔ پھر بھی جب اس کا سامان تقسیم کے لیے نکالا گیا تو کئی من سونا چاندی اور بے شمار قیمتی جواہرات برآمد ہوئے۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ تذکرہ شمیم سخن و تذکرہ حکیم قاسم
ماہنامہ المعارف لاہور مئی ۱۹۸۰ء مقالہ پروفیسر علم الدین سالک)

بی بی لحاظ النساءؒ

ان کا شمار تیرھویں صدی ہجری کی ممتاز اہلِ علم خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کو علم حدیث سے بہت لگاؤ تھا۔ پہلے بھوپال میں وہاں کے ایک نامور عالم مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ سے حدیث پڑھی۔ پھر دلی جاکر شیخ الکل میاں نذیر حسین محدثؒ دہلوی[1] کے درس میں شریک ہوئیں اور فن کی تکمیل کے بعد سند

---

[1] علامہ سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (میاں جی) کا شمار یگانۂ عصر علماء اہلحدیث میں ہوتا ہے۔ ۱۲۲۰ھ میں موضع بلتھوا قصبہ سورج گنج ضلع مونگیر صوبہ بہار (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید جواد علی شاہ تھا۔ ابتدائی تعلیم والدِ گرامی سے حاصل کی پھر صادق پور جاکر مولوی سید محمد حسین سے مشکوٰۃ المصابیح اور ترجمہ قرآن مجید پڑھا۔ ۱۲۴۳ھ میں غازی پور اور الٰہ آباد ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اثنائے سفر میں کچھ عرصہ الٰہ آباد کے دائرہ شاہ اجمل میں قیام کیا اور وہاں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ دہلی میں مولانا اخوند شیر محمدؒ، مولانا عبدالخالقؒ، مولانا جلال الدین ہرویؒ، مولانا کرامت علی اسرائیلیؒ، مولانا سید محمد بخش اور مولانا شاہ محمد اسحاقؒ نبیرہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے جملہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی۔ دہیں ان کی شادی مولانا عبدالخالقؒ کی صاحبزادی سے ہوگئی۔ شاہ محمد اسحاقؒ ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے تو میاں صاحب نے اورنگ آبادی مسجد میں تفسیر اور حدیث کا درس شروع کیا۔ ہزاروں بندگانِ خدا اس سے فیض یاب ہوئے۔ یہ سلسلہ پچاس برس تک جاری رہا۔ ۱۲۸۰ھ میں انبالہ کے مشہور مقدمۂ علماء صادق پور کے سلسلے میں قریباً ایک سال راولپنڈی جیل میں قید رہے لیکن بے گناہ ثابت ہوئے۔ ۱۳۲۵ھ

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حاصل کی۔ اس وقت ان کی عمر صرف انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے تمام عمر علم حدیث کی اشاعت میں گزار دی۔

۱۳۰۹ھ ہجری میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

میں حکومتِ ہند نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ سو سال کی عمر میں رجب ۱۳۲۰ھ میں وفات پائی۔ اور دہلی کے قبرستان شیدی پورہ میں مدفون ہوئے۔ نہایت عابد و زاہد متقی اور فیاض تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ارشد تلامذہ کے نام یہ ہیں:

حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوریؒ۔ سید عبدالجبار غزنویؒ۔ سید محمد عبداللہ غزنویؒ۔ مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ۔ مولانا حافظ محمد لکھویؒ۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادیؒ۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ۔ مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادیؒ۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ وغیرہ۔

ملکہ پرتو پیالہ

ترکی کے عثمانی فرمانروا سلطان عبدالعزیز (۱۲۷۷ھ تا ۱۲۹۳ھ) کی والدہ تھیں۔ بڑی نیک سیرت، باخدا اور مخیر خاتون تھی۔ اس نے ۱۲۸۸ھ میں ایک عالیشان جامع مسجد مع ایک کتب خانہ، ایک شفا خانہ اور ایک لنگر خانہ تعمیر کرائی، اور بے شمار مؤذن، خدام، پیش امام اور خطیب اس کی خدمت کے لیے مقرر کیے۔ یہ مسجد قسطنطنیہ کے محلہ آقسرائے میں واقع ہے۔ اس کے پاس ہی اس ملکہ کی قبر ہے ــــ ملکہ پرتو پیالہ نے قسطنطنیہ کے قریب "ارتاکوئی" میں ایک اور جامع مسجد بھی بنوائی۔ یہ "یینی والدہ جامع" کہلاتی ہے۔ سلطان عبدالعزیز کو اپنی ماں سے بہت محبت تھی۔ اس نے ایک لاکھ پونڈ کی لاگت سے اپنے لیے ایک چھوٹا جہاز تیار کرایا تو اس کا نام اپنی والدہ کے نام پر "پرتو پیالہ" رکھا۔ (مشاہیر نسواں)

بادشاہ بیگم دہلوی

تیرھویں صدی ہجری میں یگانۂ روزگار خطاطہ ہوئی ہیں۔ فن کتابت (خوشنویسی) انہوں نے اپنے دور کے وحید العصر خوشنویس استاد محمد امیر پنجہ کش دہلوی سے سیکھا۔ ان کی کتابت دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں ــــ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر نے ان کے ہاتھ کی وصلیاں دیکھیں تو دنگ رہ گئے اور ان کو نادر قلم کا خطاب دیا۔ ایک بلند پایہ خطاطہ ہونے کے علاوہ وہ اچھی عالمہ اور شاعرہ بھی تھیں اور فن طب میں بھی دسترس رکھتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ انگریزی زبان بھی جانتی تھیں۔ حالانکہ اس زمانے میں کسی مسلمان خاتون کی انگریزی زبان سے واقفیت بہت عجیب بات سمجھی جاتی تھی۔ (مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی شمس النساءؒ

حیدرآباد دکن کی رہنے والی تھیں۔ جملہ علوم دینی میں یکتائے زمانہ تھیں۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ قرآن تفسیر اور علوم دینی میں ماہرانہ دستگاہ رکھتی تھیں۔ حدیث کی جملہ مسانید پر گہری نظر تھی۔ اکثر عورتوں کے مجمع میں وعظ و ہدایت کیا کرتی تھیں۔ زندگی کے آخری سالوں میں انہوں نے اپنا بیشتر وقت وعظ و ہدایت ہی میں گزارا۔ ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں وفات پائی۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

صولت النساء بیگمؒ

مرزا رحمت اللہ کیرانویؒ ہندوستانیوں کی جنگِ آزادی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء کے ایک عظیم مجاہد تھے۔ جنگِ آزادی (جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا) بوجوہ کامیاب نہ ہو سکی تو مولانا ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک دینی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کیا مگر وسائل کا فقدان تھا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں سلطان ٹیپو شہیدؒ کے خاندان کی ایک مخیر اور متقی خاتون صولت النساء بیگم کلکتہ سے حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ پہنچیں۔ ان کے سامنے مدرسہ کی تجویز پیش کی گئی تو انہوں نے اس کی پُرزور تائید کی اور تیس ہزار روپیہ کی خطیر رقم (جو آج کل کے کئی لاکھ روپے کے برابر ہوتی ہے) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی خدمت میں پیش کر دی۔ مولاناؒ نے مدرسہ قائم کر کے اس کا نام اس مخیر خاتون کے نام پر "مدرسہ صولتیہ" رکھا۔ یہ مدرسہ آج تک قائم ہے اور اس سے لاکھوں طالبانِ علم اب تک فیض یاب ہو چکے ہیں۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

بی بی اسماء عبرت

تیرھویں صدی ہجری میں مشہور خطاطہ ہوئی ہے۔ استنبول (قسطنطنیہ) کی رہنے والی تھی۔ والد کا نام احمد آقا تھا۔ اس کی شادی اپنے دور کے سرآمدِ روزگار خطاط محمود سے ہوئی۔ فاضل شوہر نے اس کو ایسی عمدہ تعلیم دی کہ اس کا خط اپنے خط جیسا بنا دیا۔ بعض اوقات محمود خطاط اپنی بیوی اسماء عبرت کے لکھے ہوئے مخطوطات اپنے نام سے لوگوں کو دے دیا کرتا تھا اور وہ مطلق تمیز نہ کر سکتے تھے کہ یہ محمود کے لکھے ہوئے ہیں یا اس کی اہلیہ کے۔ اسماء عبرت کی خوشخطی کے نمونے ابھی تک ترکی میں محفوظ ہیں اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ (مشاہیر نسواں)

بی بی رشحہ

تیرھویں صدی ہجری میں فارسی زبان کی مشہور شاعرہ ہوئی ہے۔ وطن مالوف ایران تھا۔ ہاتف کاشانی کی بیٹی اور مرزا علی اکبر نظیری کی اہلیہ تھی۔ سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا والد، شوہر اور بیٹا مرزا احمد کشتہ سبھی شاعر تھے۔ اصل نام بیگم تھا اور رشحہ تخلص کرتی تھی۔ صاحبِ دیوان تھی۔ اس کے دیوان میں تقریباً ۳۱ ہزار اشعار ہیں۔ ان میں شاہ ایران فتح علی شاہ قاچار (۱۲۱۱ھ تا ۱۲۵۰ھ) اور اس کے خاندان کی مدح میں کئی قصائد شامل ہیں۔ نمونہ کلام ہے:

دل رفت و زخونِ دیدہ مارا ——— پیداست برخ ازاں علامت

می تپد از شوق دل در سینہ ام گوئی کہ باز ——— تیر دلداری بدل زابرو کمانے می رسد

اشکم ز ہجر تو ہر روز تا سمک ——— آہم ز دستِ خوئے تو ہر شام تا سماک

آں بتِ گلچہرہ یارب بستہ از سنبل نقاب ——— یا بافسوں کرد پنہاں در دل شب آفتاب

بقصدِ صید تو چوں رشحہ دید مش گفتم ——— کسے ندیدہ شکارِ مگس کند شہباز

(تذکرۃ الخواتین)

چودھویں صدی ہجری

۱۔ نواب سلطان جہاں بیگمؒ (والیہ ریاست، عالمہ، فاضلہ، صالحہ، مخیر، معارف پرور)

۲۔ بی بی فاطمہ صغریٰؒ (عالمہ فاضلہ، شاعرہ، مصنفہ)

۳۔ فاطمہ بنت عبداللہؒ (مجاہدہ)

۴۔ بی اماںؒ (دلادر، حوصلہ مند، صابرہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنیوالی ماں آزادی کی خاطر مصیبتیں جھیلنے والی)

۵۔ صاحبزادی احمدی بیگمؒ (دیندار، پرہیزگار، قناعت پسند)

۶۔ بی بی مقبول النساء بیگم (بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۷۔ صغریٰ بی بیؒ (صالحہ۔ مخیر۔ علم دوست)

۸۔ بی بی خجستہ اختر بانو (بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۹۔ بی بی بختیہؒ (مخیرہ)

۱۰۔ بی بی بدر النساء بیگمؒ (عالمہ، فاضلہ، طباع، دیندار اعلیٰ درجے کی منتظمہ، مصنفہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۱۔ محترمہ محمودہ بیگمؒ (عالمہ، فاضلہ، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۲۔ سیدہ نشاط النساء بیگمؒ (بلند حوصلہ، بہادر قناعت پسند، باوفا بیوی، آزادی کی خاطر مصیبتیں جھیلنے والی)

۱۳۔ خالدہ ادیب خانم (عالمہ، فاضلہ، مجاہدہ، ادیبہ مصنفہ، جامع کمالات)

۱۴۔ نازلی بیگم (عالمہ، فاضلہ، مہمان نواز، علم دوست)

۱۵۔ زہرا بیگم (ذہین، طباع، تحریر و تقریر میں طاق)

۱۶۔ عطیہ بیگم (عطیہ فیضی) (ذہین و فطین، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کی شیدائی)

۱۷۔ اماں بی رقیہ بیگمؒ (عابدہ، زاہدہ، قناعت پسند، حوصلہ مند، بچوں کی بہترین تربیت کرنے والی ماں)

۱۸۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ مادرِ ملت (قائدِ اعظمؒ کی دستِ راست بہن، حوصلہ مند، بیباک، حق گو)

۱۹۔ آپا فاطمۃ الکبریٰؒ (خطاطہ، صالحہ، مبلغہ)

۲۰۔ سیدہ خیر النساء بہترؒ (عالمہ، حافظہ، شاعرہ، مصنفہ، صالحہ)

۲۱۔ سیدہ امۃ اللہ تسنیمؒ (عالمہ، مصنفہ، شاعرہ، صالحہ)

۲۲۔ آپا جی حمیدہ بیگمؒ (عالمہ، مصنفہ، ادیبہ، مبلغہ، صالحہ)

۲۳۔ نور الصباح بیگم (ادیبہ، شاعرہ، سیاستدان)

نواب سلطان جہان بیگم

۱۳۱۸ھ/۱۹۰۱ء ہجری میں اپنی والدہ نواب شاہجہان بیگم کی وفات کے بعد بھوپال کی حکمران بنیں۔ وہ ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئیں —— والد نواب باقی محمد خان (المتوفی ۱۲۸۲ھ) تھے۔ ان کی شادی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء ہجری میں احتشام الملک عالی جاہ نواب احمد علی خان افغان رئیس میرانزئی تخیل سے ہوئی۔ اللہ نے ان سے ان کو تین بچے عطا کیے لیکن افسوس کہ مسند نشینی کے صرف چھ ماہ بعد نواب احتشام الملک بہادر یکایک وفات پا گئے اور نواب سلطان جہان بیگم بیوہ ہو گئیں۔ یہ ان کے لیے جانکاہ صدمہ تھا لیکن انہوں نے ایک سچی مومنہ کی طرح بڑے صبر و تحمل سے کام لیا اور اس ہوش ربا موقع پر ان جذبات کا اظہار کیا:

”ایسے وقت میں جبکہ سچے مشیروں اور قابل ہمدردوں کی مجھے سخت ضرورت تھی، ایک ایسے بیدار مغز خیر خواہ گرامی قدر مشیر کا جس نے ۲۷ سال ہر طرح کی رفاقت اور خیر خواہی سے میرے ساتھ بسر کیے اور جس سے زیادہ دنیا میں کوئی عمدہ اور قابل مشیر نہ تھا۔ خانگی معاملات اور ریاستی انتظامات میں جیسی اعلیٰ اور صائب رائیں انہوں نے دیں اور جیسی دل سوزی کے ساتھ میری ہمدردی کی، اس کا کامل اندازہ میرا دل ہی کر سکتا ہے، پس اس کا یکایک انتقال کر جانا میرے لیے کیسا سخت اور دل شکن اور غم انگیز حادثہ تھا۔ اگر ہم غمناک حادثوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو بہت سے حادثے ایسے ملیں گے جو خدا کے نہایت نیک اور برگزیدہ بندوں پر گزرے ہیں

اور ان سے محض قضائے الٰہی پر صبر کی آزمائش مقصود ہوتی ہے۔
دراصل خداوند کریم انسانوں کے صبر کی آزمائش صدمات اور تکالیف سے کرتا ہے۔ اگر انسان اس آزمائش میں جو صبر کا حقیقی مفہوم ہے، پورا اترتا ہے تو وہ کامیاب سمجھا جاتا ہے اور خدا اس کو اپنی محبت اور رحمت کی خوشخبری ان الفاظ میں دیتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ [1]

مجھ پر جو عین مشکلات کے وقت یہ سخت حادثہ گزرا وہ دراصل میرے صبر کا امتحان تھا۔ میں نے خدا کی مرضی پر صبر کیا اور قضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا کر آیاتِ کریمہ حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ۔ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ [2] کو اپنا ورد کیا جو میرے دل کو اطمینان دیتی تھیں کیونکہ خدائے عزوجل فرماتا ہے أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ [3]۔"

نواب سلطان جہاں بیگم نے شعور کی آنکھیں کھولیں تو ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا گیا۔ انہوں نے ریاست کے مدارالمہام (وزیر اعظم) مولوی جمال الدین خان بہادر

---

[1] ترجمہ: اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنا دو۔ ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی رحمت اور مہربانی ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں۔ (بقرہ - ۱۵۷)

[2] ترجمہ: ہم کو خدا کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے (آل عمران - ۱۷۳) وہ خوب حمایتی اور خوب مددگار ہے۔ (الانفال - ۴۰) [3] ترجمہ: سن رکھو کہ خدا کی یاد سے دل آرام پاتے ہیں۔ (الرعد - ۲۸)

سے قرآنِ پاک ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔ وہ اپنے دَور کے بہت بڑے عالمِ دین بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کو اردو فارسی عربی اور انگریزی زبانوں کی تعلیم بھی دی گئی اور امورِ خانہ داری نیز شہسواری اور نشانہ بازی میں بھی طاق کیا گیا۔

ان کا عہدِ طفلی اپنی نانی نواب سکندر بیگم کی آغوشِ شفقت میں گزرا! انہوں نے بڑی شفقت اور توجّہ سے نواسی کی دینی تربیت کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ نواب سلطان جہان بیگم نے عمر بھر نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن کا کبھی ناغہ نہ کیا۔ قرآنِ حکیم سے ان کو دلی لگاؤ اور گہری عقیدت تھی۔ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید نادار مسلمانوں اور طلبہ میں تقسیم کرتیں۔ تجوید اور قرأت کے فن کو فروغ دینے کے لیے انہوں نے بھوپال میں مدرسہ حفاظ قائم کیا۔ اپنے بیٹوں اور پوتوں کو بڑے اہتمام سے قرآن مجید پڑھایا اور ایک فرزند صاحبزادہ عبید اللہ خان کو قرآنِ پاک حفظ کرایا۔ جس دن انہوں نے قرآن حفظ کر لیا ان کو ناقابلِ بیان مسرّت ہوئی۔ اس سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہیں:

"نواب احتشام الملک بہادر کی توجّہ ہر وقت اُن پر تھی اور اس دن کی خوشی تو بیان نہیں ہو سکتی جس دن کہ قرآن مجید کی آخری سورۃ صاحبزادہ صاحب نے حفظ کر کے ہم کو سُنائی۔ اُن کو مجھ سے زیادہ اور مجھ کو ان سے زیادہ مسرّت تھی۔"

بے حد پابندِ شریعت تھیں۔ زندگی بھر نماز قضا نہ کی۔ اسی طرح بچپن سے لے کر اخیر عمر تک رمضان المبارک کے روزے بھی باقاعدگی سے رکھتی رہیں صرف ایک آدھ مرتبہ علالت کی وجہ سے چند روزے قضا کرنے پڑے۔ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کا خاص اہتمام کرتیں اور پورا قرآنِ پاک سنتیں۔ ہر سال زکوٰۃ کا ایک ایک پیسہ بڑی باقاعدگی سے مستحقین میں تقسیم کرتی تھیں اور اس میں کسی قسم کی تاخیر مطلق روا نہ

رکھتی تھیں۔

پردے کی سخت پابند تھیں۔ عمائدِ حکومت ہوں یا ماتحت ملازمین، ہمعصر والیانِ ریاست ہوں یا دوسرے ملکوں کے فرمانروا، گورنر ہوں یا وائسرائے وہ ان سے ملاقات کے وقت ہمیشہ برقع میں مستور رہتی تھیں۔ زندگی کے آخری سال میں انہوں نے قرآنِ پاک کی رخصت کا فائدہ اٹھا کر پردہ ترک کیا لیکن وہ بھی صرف چہرے کی حد تک، باقی تمام جسم برقع میں مستور رہتا تھا۔ اُس وقت وہ ۷۱ برس کی تھیں۔

عنانِ حکومت سنبھالنے کے ایک ہی سال بعد وہ حج بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس روانہ ہوگئیں اور وہاں پورے پانچ ماہ قیام کے بعد واپس بھوپال آئیں۔ اپنے سفرِ حج کا حال انہوں نے اپنی ایک کتاب "ریاض الراحین" میں بڑے ذوق و شوق سے لکھا ہے۔

نواب سلطان جہان بیگم نے اپنے دَورِ حکومت میں ہندوستان کے مختلف مقامات اور یورپ کے طولانی سفر بھی کیے۔ اس دوران میں سخت سے سخت سردی میں بھی انہوں نے نماز قضا نہ کی اور نہ تلاوتِ قرآن کا ناغہ کیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی پارٹی یا ملاقات کا وقت ایسا نہ مقرر کیا جائے جس میں نماز کے قضا ہو جانے کا خدشہ ہو۔

نواب سلطان جہان بیگم کا دستِ سخاوت بہت کشادہ تھا اور معارف پروری میں تو وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ وہ ریاست اور بیرونِ ریاست کے بہت سے علمی اداروں اور اربابِ فضل و کمال کی فراخدلی سے مالی مدد کرتی رہتی تھیں۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو وہ مسلمان طلبہ کے لیے بہترین درسگاہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ اپنے فرزند صاحبزادہ حمید اللہ خان مرحوم کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان یا اجمیر کے چیفس کالج بھیجنے کے بجائے علی گڑھ بھیجا اور انہوں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی ——— علی گڑھ میں انہوں نے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی جس پر زرِ کثیر صرف ہوا۔ اس عمارت کا نام انہی کے نام پر "سلطان جہان منزل" رکھا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے بعد وہ کچھ عرصے تک اس کی وائس چانسلر رہیں اور اس ادارے کو عرصے تک گرانقدر مالی امداد دیتی رہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم کو سرورِ عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بے پایاں عقیدت اور محبت تھی۔ ۱۳۳۰ھ ہجری میں علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبیؐ لکھنے کا ارادہ کیا تو مالی مشکلات ان کے راستے میں حائل ہوگئیں اور انہوں نے قوم سے پچاس ہزار روپیہ فراہم کرنے کی اپیل کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ تمام رقم اپنے پاس سے دے دی اور علامہ شبلیؒ کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر دیا۔ اس واقعہ کا ذکر نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی آپ بیتی "تزکِ سلطانی" میں اس طرح کیا ہے:

"چونکہ اردو میں اس وقت تک آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی کوئی مفصل اور مستند سوانح عمری موجود نہیں ہے اس لیے جب مجھے معلوم ہوا کہ شمس العلماء مولانا شبلی جو تاریخ اسلام کے ایک باکمال اور مستند عالم ہیں، سیرتِ نبویؐ مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن مالی امداد سے مجبور رہیں اور انہوں نے ایک اپیل امداد کے لیے شائع کی ہے تو میں نے اس اپیل کو دیکھا اور افسوس ہوا کہ ایک ایسی ضروری اور مذہبی تصنیف کے لیے پبلک سے اپیل کرنے کی نوبت پہنچی ہے۔ میں نے اُن کو مطلع کیا کہ وہ فوراً کام شروع کر دیں اور جس قدر روپے کے لیے اپیل کی گئی ہے وہ میں دوں گی۔"

چنانچہ علامہ شبلیؒ اس کام میں یکسوئی سے مشغول ہو گئے لیکن ابھی وہ اس کا پہلا حصہ ہی مرتب کر پائے تھے کہ پیغام اجل آپہنچا۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اسے ملاحظہ فرما کر بڑی مسرت

کا اظہار کیا اور فرمایا:—— "یہ تو بڑا کام ہوا"

اس موقع پر مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب "سیرۃ عائشہؓ" اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی "سیرالصحابہ" اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کے مسودات کا ذکر کیا اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ذاتی پریس نہ ہونے کی بناء پر ان کتابوں کی اشاعت میں جو مشکلات پیش آ رہی تھیں، اُن کا اظہار کیا تو بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا:

"پریس کی کیا قیمت ہوگی؟"

مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے کہا۔ "تین ہزار روپے"

بیگم صاحبہ نے فرمایا—— "ایسے نیک کاموں کے لیے تین ہزار روپے کیا چیز ہیں۔ ابھی حکم لکھے دیتی ہوں۔"

چنانچہ یہ رقم ادا کرنے کے لیے فوراً حکم صادر کر دیا۔

نواب سلطان جہاں بیگم بڑی خدا ترس اور عدل پرور حکمران تھیں انہوں نے اپنی ریاست میں عادلانہ نظام قائم کیا اور عدلیہ کے افسروں کو حکم دیا کہ کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت احکامِ الٰہی کو پیش نظر رکھیں اور پورا پورا انصاف کریں۔

۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) میں جب نواب سلطان جہاں بیگم کی عمر اڑسٹھ برس کے لگ بھگ تھی وہ اپنے فرزند صاحبزادہ حمیداللہ خاں کے حق میں حکومت سے دست بردار ہوگئیں۔ نئے حکمران کی مسند نشینی کے موقع پر جو دربار منعقد ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم نے فرمایا:——

"آج ۲۵ برس سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا تھا کہ جب مالکِ حقیقی نے ملکِ محروسہ بھوپال کی عنانِ حکومت میرے سپرد کی۔ آپ سب کو علم ہے کہ میں نے اپنی حیثیت مثل ایک امین کے سمجھ کر اور اس کی ودیعتِ کبریٰ کے اہم فرائض کا احساس کرکے فوراً اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ ریاست کے مفاد اور رعایا کی فلاح

کو اپنا مآلِ زندگی بنایا اور مسلسل ۲۵ برس تک اس مقصدِ عظیم کے حصول میں سعی و محنت کو اپنا اوّلیں فرض تصوّر کیا اور جو ذرائع و وسائل ممکن ہوئے ان کی بہم رسانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ میں اپنے احکم الحاکمین کا شکر کرتی ہوں کہ اس نے ہر موقع پر اور ہر تدبیر میں میری اعانت کی اور اس امر کا اندازہ کہ میری کوششیں ریاست بھوپال اور میری رعایا کی بہبودی اور فلاح میں کس قدر کامیاب ہوئیں، آپ لوگ خود کر سکتے ہیں۔"

اپنی اس تقریر کے آخر میں انہوں نے نئے حکمران کو مخاطب کر کے پہلے چند آیاتِ قرآنی تلاوت کیں جن میں عدل و احسان کرنے، غریبوں، یتیموں، حاجتمندوں اور مسافروں کی دستگیری کرنے، فحاشی، منکر اور سرکشی سے باز رہنے، نماز قائم کرنے اور عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی اور بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کی:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ [1] (الاحقاف: ۱۵)

یہ دعا مانگتے ہوئے اُن پر رقّت طاری تھی اور حاضرین بھی چشم پُرآب تھے۔

اس کے چار سال بعد ۱۳۴۸ھ ۱۹۳۰ء میں اپنے وقت کی یہ عظیم خاتون دُنیائے فانی سے کوچ کر کے دارالبقا میں پہنچ گئیں۔ دنیا کے تمام مسلمانوں نے ان کی وفات پر سخت رنج و الم کا اظہار کیا۔ ملک کے تمام وقیع اخبارات و رسائل نے تعزیتی

---

[1] ترجمہ: "اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کی شکر گزار ہوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد میں صلاح و تقویٰ دے۔ میں تیری طرف رجوع کرتی ہوں اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔"

اداریے لکھے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف اعظم گڈھ میں "والیہ بھوپال سلطان جہان بیگم خادمۂ ملت و مخدومۂ اُمت کا ماتم" کے عنوان کے تحت اپنے جو تاثرات قلمبند کیے ان سے مرحومہ کے مقام اور مرتبہ کا بخوبی اندازہ کیا سکتا ہے۔ چند اقتباسات حسب ذیل ہیں:

"علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ماتم نہ صرف بھوپال نہ صرف ہندوستان، نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں ان کا دورِ حکومت ——— بھوپال کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔"

"سلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں جو آج مصلحینِ اُمت کا آئیڈیل ہے۔ ان کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدرِ ضرورت تھی۔ وہ نہ صرف فرمانروا تھیں بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی رئیسۂ علیا، مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم و فنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ لیکن ان ہر قسم کے انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی اور تعلیمی کارناموں سے بڑھ کر ان کا حقیقی شرف ان کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش و ولولہ تھا۔"

"وہ ہر قومی، مذہبی و علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں اور اس کے لیے عملی قدم اٹھاتی تھیں۔ مسلم یونیورسٹی، مدرسۂ دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور ووکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے ان کی امداد و اعانت کے طوقِ منت سے گرانبار ہیں۔ دارالمصنفین

اور سیرۃ نبویؐ کو کہا جائے کہ انہیں کے دستِ کرم سے ان کی بنیاد پڑی خصوصاً سیرۃ النبیؐ جیسی اہم کتاب کا عالمِ وجود میں آنے کا شرف صرف اُن کی ذاتِ گرامی کے لیے مخصوص ہے۔ امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی شفاعتِ رسولِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے استحقاق کے لیے کافی ہوگی۔"

"سلطانہ مرحوم کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی اور ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا۔ دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے۔ پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھی۔ کورنش و تسلیمات و رکوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا۔ سب سے پہلے "السّلامُ عَلیکمُ" کی بلند آواز اُن کی طرف سے آتی تھی۔ شاید ہی کوئی اُن سے ملا ہو اور ان کے اخلاق و معلومات کی وسعت سے وہ متاثر نہ ہوا ہو۔ علامہ شبلی مرحوم غالباً ۱۹۰۶ء میں ان سے ملے تو ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے جذبات "الندوہ" کے چند صفحات میں ظاہر کیے۔ مجھے دو تین مرتبہ ان کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروفِ کلام رہیں کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خود مختار فرماں روا سے بات کر رہا ہے۔"

"ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور اس کے لیے ایک خاص محکمہ تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے مسودات بارہا دیکھے۔ ان کے برمحل اعتراض اور باموقع سوجھ حیرت انگیز تھی۔ اپنی تصنیفات کے مسودوں پر خود نظرِ ثانی کرتی تھیں اور اپنے قلم سے ان پر نشان بناتی تھیں۔

ان کو رسولِ پاک علیہ الصّلوٰۃ سے بے مثال عقیدت تھی جس کی کھلی

دلیل خود سیرۃ نبوی کا وجود ہے مگر اس کے علاوہ ان کی گفتگو، تحریر ہر چیز سے ان کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرۃ کی پہلی جلد لے کر جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو بڑے اشتیاق سے انہوں نے دریافت کیا تھا کہ عالم رویا میں رسول انام علیہ السلام کی زیارت کس طرح ہو سکتی ہے۔ عرض کی کہ کتب حدیث و سیرۃ کے مطالعہ اور درود و سلام کی کثرت سے۔"

نواب سلطان جہان بیگمؒ نے پچاس کے قریب تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے بیشتر کا موضوع مذہب، اخلاق اور خانہ داری ہے۔ ان میں سے چند اہم اور مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں:

سیرتِ مصطفےٰؐ، سیرت شاہجہانی، ریاض الرّاحین، تزکِ سلطانی، گوہر اقبال، خورشید اقبال۔

(بیگماتِ بھوپال، مشاہیر نسواں، صنفِ نازک، یادِ رفتگاں وغیرہ)

بی بی فاطمہ صغریٰ

بانکی پور پٹنہ (بہار۔ بھارت) کے مشہور کتب خانہ کے بانی مولوی خدابخشؒ کی صاحبزادی تھیں۔ نہایت عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ انہوں نے کئی علمی کتابیں تصنیف کیں۔ شعر و شاعری کا بھی عمدہ مذاق رکھتی تھیں۔ (مشاہیر نسواں)

فاطمہ بنتِ عبداللہ رح

فاطمہ بنتِ عبداللہ رح نہ کسی ملک کی فرمانروا تھی اور نہ کسی فرمانروا کی بیٹی۔ نہ وہ کوئی عالمہ فاضلہ خاتون تھی اور نہ کسی فن یا ہنر میں یکتا ___ وہ تو گیارہ سال کی ایک معصوم اور پاکباز بچی تھی، لیکن اس نے اپنے خونِ شہادت سے صفحۂ تاریخ پر جو داستان رقم کی اس کی بدولت وہ آج تک فرزندانِ توحید کے دلوں پر حکومت کر رہی ہے، اس کا نام سن کر ان کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں، اور وہ بے اختیار اس پر رحمت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ جب تک مہر و ماہ میں روشنی باقی ہے فاطمہ بنتِ عبداللہ کے خونِ شہادت کی سرخی کا پرتو بھی باقی رہے گا۔

فاطمہ طرابلس الغرب (لیبیا) کے ایک طاقتور قبیلے براعصہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد شیخ عبداللہ رح اس قبیلے کے سردار اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ وہ ایک دیندار، بہادر، غیور اور مخلص مسلمان تھے اور اپنے قبیلے میں عبدہٗ کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ عبداللہ کے نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی صرف ایک لڑکی فاطمہ تھی جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے فاطمہ نے صحرا کے آزاد ماحول میں پرورش پائی، اور گھر کے دینی ماحول میں تعلیم حاصل کی۔

۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا۔ اس زمانے میں طرابلس الغرب خلافتِ عثمانیہ کے زیرِ نگین تھا۔ ترکی حکومت نے بھی اٹلی کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور دونوں ملکوں کے درمیان خونریز لڑائی چھڑ گئی۔ طرابلس کے مسلمان دعوتِ جہاد پر بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے اور جوق در جوق میدانِ جہاد میں پہنچ گئے، ان کے ساتھ ان کی خواتین اور بچے بھی تھے۔ عورتوں

میں بوڑھی خواتین کے ساتھ نوعمر لڑکیاں تک شامل تھیں جن کے ابھی کھیل کود کے دن تھے اور ایسی خواتین بھی تھیں جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے لیکن وہ سب جذبۂ جہاد سے سرشار تھیں۔ وہ زخمی مجاہدین کو پانی پلاتیں اور ان کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

اس لڑائی میں شیخ عبداللہؒ نمایاں حصہ لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر طرابلس کے مختلف قبائل کو متحد اور منظم کر کے میدان جہاد میں لا کھڑا کیا تھا۔ خود ان کے اپنے جذبۂ جہاد کی یہ کیفیت تھی کہ اپنے گھر کا تمام ساز و سامان راہِ حق میں ترک افسروں کو دے دیا تھا اور وہ وظیفہ لینے سے بھی معذرت کر دی تھی جو خلافتِ عثمانیہ کی طرف سے ایامِ جنگ میں عرب مجاہدین کو دیا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے قبیلے اور خاندان کے سبھی لوگ جہاد میں شریک تھے ان میں شیخ کی لختِ جگر گیارہ سالہ فاطمہ بھی شامل تھی۔ اس کمسن مجاہدہ نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو مجاہدین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بھی زخمی مجاہدوں کو اپنے مشکیزے سے پانی پلا رہی ہوتی جب دشمنوں کی طرف سے گولوں کی بارش ہو رہی ہوتی۔ اُسے ایک ہی دھن تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے زخمی مجاہدوں کی مدد کے لیے ان تک پہنچ جاؤں یا اسی کوشش میں اپنی جان قربان کر دوں۔ ایک ترک افسر ڈاکٹر اسماعیل شناتی نے اس جنگ کے چشم دید حالات لکھے ہیں ان میں وہ اس ننھی مجاہدہ کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"میں نے سب سے پہلے کمسن فاطمہ کو اس وقت دیکھا جب میں اپنے فوجی دستے کے ساتھ عزیزیہ سے زوارہ پہنچا۔ یوں تو فوج میں بہت سی خواتین اور لڑکیاں تھیں کیونکہ بیشتر عرب مجاہدین اپنے اہلِ خاندان کو بھی ساتھ لائے تھے لیکن فاطمہ ان میں منفرد نظر آتی تھی ایک تو اس لیے کہ وہ بہت کم عمر تھی اور دوسرے

اس لیے کہ خوف یا ڈر اس کو چھُو کر بھی نہ گیا تھا، توپیں گولے اگل رہی ہوں، گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو یا تلواروں اور سنگینوں سے دست بدست لڑائی ہو رہی ہو، غرض کیسا ہی خطرناک موقع ہو فاطمہ اپنے مشکیزے سمیت وہاں پہنچ جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ شوق اس کی چھوٹی سی عمر سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ بارود کے دھوئیں سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ توپوں کی گڑگڑاہٹ سے زمین ہل رہی تھی۔ گولوں کے پھٹنے سے بار بار چمک پیدا ہوتی اس کے ساتھ ہی زخمیوں کی چیخ پکار حشر برپا کر دیتی۔ اس ہولناک موقع پر وہ ننھی مجاہدہ اپنا اونچا کرتا پہنے اور پھٹی ہوئی چادر کمر کے گرد لپیٹے بے بس اور مجبور زخمیوں کی مدد کے لیے دوڑتی پھرتی تھی جیسے خدا نے آسمان سے کوئی فرشتہ بھیج دیا ہو۔ فاطمہ کو اپنے گرد و پیش کا جیسے علم ہی نہ تھا اور ایک ہی لگن تھی کہ زخمیوں تک پانی پہنچاؤں۔ کچھ دیر بعد ننھی فاطمہ میرے قریب سے گزری، میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا، ننھی کیا تجھے معلوم نہیں کہ تو اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔ فاطمہ نے کہا۔ ” مجھے چھوڑ دو کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ اسلام اور وطن کے کتنے جاں نثار پانی نہ ملنے کے باعث جاں بلب ہیں اور شاید تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ میرے ابا جان اور امی جان بھی اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کر چکے ہیں “

یہ کہہ کر اس نے اپنا بازو چھڑا لیا اور تیزی سے دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ ننھی فاطمہ کہا کرتی تھی کہ مجھے سرخ رنگ بہت

پسند ہے۔ آہ یہی رنگ میں نے ایک دن اس کی گردن کے نیچے
بہتا ہوا دیکھا۔"

اثنائے جنگ میں ایک دن بارہ ہزار سے زیادہ اطالوی فوج نے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے بھی کم تھی لیکن انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد دشمن نے ہولناک گولہ باری شروع کر دی۔ ننھی فاطمہ برستے گولوں میں زخمیوں کو پانی پلاتی پھرتی تھی۔ عصر کے وقت عربوں کا ایک دستہ سر بکف دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا۔ ایک ترک افسر احمد نوری بک نے انہیں خطرے میں دیکھا تو کچھ ترک سپاہیوں کو ساتھ لے کر ان کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور لڑتا بھڑتا دشمن کے مشرقی توپ خانے تک جا پہنچا۔ وہاں تازہ دم اطالوی فوج نے مجاہدین کو گھیر لیا۔ ترک مجاہدین یہ گھیرا توڑ کر نکل آئے لیکن چار ترک سپاہی شدید زخمی ہو کر زمین پر گر گئے! اطالوی درندے ان بے بس زخمیوں کو اپنی سنگینوں سے بھنبھوڑنے لگے۔ عین اس وقت چشم فلک نے ایک عجیب منظر دیکھا، ننھی فاطمہ اپنا مشکیزہ لیے ہوئے وہاں نمودار ہوئی اور مشکیزہ ایک جاں بلب زخمی کے منہ سے لگا دیا۔ دو اطالوی سپاہیوں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے تڑپ کر ایک زخمی سپاہی کی پاس پڑی ہوئی تلوار اٹھا کر ایک اطالوی سپاہی کو اس زور سے ماری کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا۔ دوسرے اطالوی سپاہی نے فوراً اس پر گولی چلا دی اور وہ شہید ہو کر فرش خاک پر گر گئی۔ یکایک مسلمان دستے یلغار کرتے ہوئے وہاں پہنچ گئے اور اطالویوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت مجاہدین نے ایک دل ہلا دینے والا منظر دیکھا —— چار ترک سپاہی سخت زخمی حالت میں زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب ننھی فاطمہ کی خون آلود نعش اس طرح پڑی ہے کہ اس کا مشکیزہ ایک زخمی ترک کے سینے پر رکھا ہے اور مشکیزے کا ایک کونہ فاطمہ کے ہاتھ میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ننھی مجاہدہ گولی کھا کر زمین پر

گرنے کے بعد بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس کے مشکیزے کا منہ زخمی مسلمان کے منہ تک نہ پہنچ سکا اور وہ جنت الفردوس میں پہنچ گئی۔

اے معصوم فاطمہ! اے دخترِ اسلام تجھ پر ہزاروں سلام!
تو نے ایثار و قربانی کی جو درخشندہ مثال قائم کی وہ ابدالآباد تک تیرا نام زندہ رکھے گی۔

حکیم الامت علامہ محمدؒ اقبالؒ نے شہیدۂ ملت فاطمہ بنتِ عبداللہؒ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت ادا کیا ہے:۔

فاطمہ بنتِ عبداللہ

عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ ۱۹۱۲ء میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی

فاطمہ تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ سعادت حورِ صحرائی تیری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تری قسمت میں تھی

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے!
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے!
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے!
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے!

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جو ابھی ابھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی ضو نا آشنا ہے قیدِ صبح و شام سے
جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نو بھی ہے!
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتو بھی ہے!

(بانگِ درا)

(ہفت روزہ "چٹان" لاہور شمارہ ۲۱/۶۲ء)

(شرف النساء جلد دوم)

بی امّاں ـــ آبادی بیگم

محترمہ آبادی بیگم جنھوں نے تاریخ میں "بی اماں" کے نام سے شہرت پائی، ایک سچی مومنہ اور نہایت عظیم خاتون تھیں۔ انہوں نے اسلامی حمیّت، حُبُّ الوطنی، جرأت، بے خوفی، ایثار و قربانی اور جذبۂ حرّیت کے جو نقوش صفحۂ تاریخ پر ثبت کیے وہ ان کا نام ابدالآباد تک زندہ رکھیں گے۔

بی اماں ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں دین اور وطن کی خاطر بھرپور حصہ لیا اور پھر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئے۔ (شاید کسی لڑائی میں شہادت پائی) اس وقت بی اماں کی عمر صرف پانچ برس کی تھی، باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے وہ معمولی تعلیم ہی حاصل کر سکیں لیکن دین اور وطن سے گہری محبت کا جذبہ انہیں ورثے میں ملا۔ ان کی شادی دربارِ رامپور کے ایک معزز و مقتدر افسر عبدالعلی خان سے ہوئی۔ ان سے بی اماں کے سات بچے ہوئے چھ لڑکے اور ایک لڑکی۔ اگست ۱۸۸۰ء میں عبدالعلی خان نے بعارضہ ہیضہ وفات پائی اور بی اماں صرف ۲۸ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں۔ انہوں نے یہ جانکاہ صدمہ بڑے حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ ان بچوں میں سے (مولانا) محمد علیؒ اور (مولانا) شوکت علی[1] آسمانِ شہرت پر آفتاب بن کر چمکے۔

---

[1] رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ کو (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ سے پہلے) ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ ایک سچے مسلمان، بے باک صحافی، شعلہ بیان خطیب، اردو کے نغز گو شاعر، تحریکِ آزادی کے نڈر مجاہد اور مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

وہ سربلندئ اسلام اور آزادئ وطن کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کرنے والے عظیم رہنماؤں میں شمار ہوئے اور "علی برادران" کے نام سے شہرت پائی۔ اگرچہ بی اماں ذاتی طور پر بھی بڑے اونچے کردار کی حامل تھیں لیکن ان کو ملک گیر شہرت اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

بہت بڑے علمبردار تھے۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں اور انگریزی زبان وادب پران کی بے مثال قدرت کا لوہا انگریز بھی مان گئے تھے۔ زندگی کے خدوخال یہ ہیں :۔

۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء کو رام پور (یو پی) میں پیدا ہوئے۔

۲۰ر اگست ۱۸۸۰ء کو والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ (والدِ محترم عبدالعلی خاں نے ہیضہ سے وفات پائی۔)

۱۸۹۰ء میں علی گڑھ اسکول میں داخلہ لیا۔

۱۸۹۴ء میں انٹرنس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

۱۸۹۸ء میں علی گڑھ کے طالب علم کی حیثیت سے الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال مزید تعلیم کے لیے انگلستان تشریف لے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

جنوری ۱۹۰۷ء میں انڈین سول سروس کے امتحان میں گھڑ سواری میں ناکام ہونے کے بعد وطن واپس آئے۔ والدہ ماجدہ نے اپنے ایک عزیز جناب عظمت اللہ خان کی صاحبزادی امجدی بیگم سے ان کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد دوبارہ آکسفورڈ چلے گئے۔

جولائی ۱۹۰۲ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ امتحان میں کامیابی حاصل کی اور وطن واپس آئے۔

۱۹۰۳ء میں ریاست بڑودہ کی سول سروس میں داخل ہو گئے۔ چند سال بعد اس سے استعفا دے دیا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان دونوں فرزندوں کی بدولت ہی حاصل ہوئی۔ بی اماں کسی بڑی جائداد کی مالک نہیں تھیں لیکن انہوں نے اپنے محدود وسائل میں بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ محمد علی اور شوکت علی انٹرنس پاس کر چکے تو ان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ بچوں کے چچا نے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی تو انہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۱۹۰۷ء میں "موجودہ بے چینی کے بارے میں کچھ خیالات" کے عنوان سے انگریزی میں مضامین کا ایک سلسلہ کیا جو "ٹائمز آف انڈیا"، بمبئی میں شائع ہوئے۔

دسمبر ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ کے چوتھے اجلاس منعقدہ ناگپور میں نمایاں حصہ لیا اور اردو زبان کی حمایت میں ایک پرجوش تقریر کی۔

جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے اخبار "کامریڈ" جاری کیا جو ستمبر ۱۹۱۲ء تک شائع ہوتا رہا۔ دارالحکومت دِلّی منتقل ہو جانے کے بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں کامریڈ دِلّی سے شائع ہونا شروع ہوا۔

فروری ۱۹۱۳ء میں "نقیب ہمدرد" جاری کیا۔

جون ۱۹۱۳ء میں اردو روزنامہ "ہمدرد" جاری کیا۔

ستمبر ۱۹۱۴ء مولانا کا مشہور اداریہ "چائس آف ترکس" "کامریڈ" میں شائع ہوا اور کامریڈ کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

اپریل ۱۹۱۵ء مولانا محمد علی اور شوکت علی رامپور میں نظر بند کیے گئے۔ وہاں سے مہرولی (دہلی) اور پھر وہاں سے لینسڈون (یو پی) میں منتقل کر دیئے گئے۔ چند ماہ لینسڈون سے چھندواڑہ جیل (سی پی) میں بھیج دیئے گئے۔

۱۹۱۷ء میں کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے (نظر بندی ابھی جاری تھی)

۱۹۱۸ء میں چھندواڑہ سے بیتول جیل منتقل کئے گئے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں انہیں بیتول جیل سے رہا کر دیا گیا۔ وہاں سے وہ امرتسر گئے اور کانگریس و مسلم لیگ کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نے چپکے چپکے اپنا زیور بیچ کر بچوں کی تعلیم جاری رکھی۔ بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بی اماں بچوں کی دینی تعلیم سے غافل ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ان کو نہ صرف دینی تعلیم بھی دلائی بلکہ ان کے دلوں میں دین سے گہرا لگاؤ بھی

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

مشترکہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت وفد کے قائد کی حیثیت سے انگلستان گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں انگلستان سے خلافت وفد ناکام واپس آیا اور مولانا نے تحریکِ خلافت کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے حکومت کے خلاف جابجا نہایت پُرجوش تقریریں کیں۔ اسی زمانے میں مولانا اور دوسرے رہنماؤں کی کوششوں سے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ قائم کی گئی۔

ستمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو مدراس جاتے ہوئے والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا شوکت علی اور پانچ دوسرے لیڈر بھی گرفتار کر لیے گئے، ان سب کو کراچی لا کر ان پر مقدمہ چلایا گیا، اور سب کو دو دو برس کی سزا سنائی گئی۔

۱۹۲۲ء میں مولانا کو کراچی سے بیجاپور جیل میں منتقل کیا گیا۔ اگست ۱۹۲۳ء میں رہا کر دیئے گئے۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں دلی سے "کامریڈ" دوبارہ جاری کیا۔ نومبر ۱۹۲۴ء میں "ہمدرد" دوبارہ جاری کیا۔

جون ۱۹۲۶ء میں کامریڈ اور مئی ۱۹۲۷ء میں ہمدرد بند ہو گیا اور ساتھ ہی مولانا کی صحافتی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

۱۹۲۷ء میں مسلمان رہنماؤں کی کانفرنس میں شریک ہوئے اور "دلی قرارداد" پاس کرنے میں حصہ لیا۔

۱۹۲۸ء میں علاج کے لیے انگلستان گئے اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں وہاں سے واپس آئے۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں برما کا مختصر دورہ کیا۔ نومبر ۱۹۲۹ء میں کانپور میں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پیدا کیا۔ وہ خود بھی نماز روزے کی پابند تھیں اور اپنی اولاد سے بھی اس کی پابندی کراتی تھیں۔ وہ اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرتی تھیں۔ کسی بچے کی مجال نہ تھی کہ ماں کا حکم ٹال دے۔ بڑے ہو کر بھی وہ ہمیشہ ماں کے اطاعت گزار

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

جمعیتہ علماء ہند کے اجلاس کی صدارت کی۔ چونکہ جمعیتہ نے شاردا ایکٹ کی حمایت کی اس لیے مولانا اس سے الگ ہو گئے اور "موتمر اسلامی" کے نام سے ایک نئی انجمن قائم کی۔

جون ۱۹۳۰ء میں مولانا شدید بیمار ہو گئے اور شملہ کے برٹش ہسپتال میں داخل ہوئے۔ اسی مہینے میں انہیں گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے وائسرے کا دعوت نامہ ملا جسے انہوں نے علیل ہونے کے باوجود منظور کر لیا۔

وسط نومبر ۱۹۳۰ء میں مولانا بحری جہاز کے ذریعے لندن روانہ ہوئے۔ سفر میں تقریباً ایک مہینہ لگا۔ راستے میں طبیعت اور بگڑ گئی۔ ذیابیطس اور خون کے دباؤ کے مریض تھے سخت محنت کی وجہ سے ایک آنکھ بھی ناکارہ ہو چکی تھی اور ڈاکٹروں نے سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہونے کا مشورہ دیا تھا لیکن آزادی کی لگن انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ کچھ دن پیرس میں علاج کرایا پھر لندن پہنچ گئے۔

۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا نے گول میز کانفرنس میں زبردست تقریر کی اور اعلان کیا کہ یا تو ہندوستان کی آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا یا یہیں مر جاؤں گا، اس طرح کم از کم ایک غلام ملک میں تو مرنے سے بچ جاؤں گا۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولانا بے ہوش ہو گئے اور ۲۴ گھنٹے سے زیادہ یہ کیفیت رہی۔ علاج سے ہوش میں آ گئے۔

یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو وزیراعظم انگلستان کے نام ایک طویل خط لکھا۔

۲ر جنوری ۱۹۳۱ء کی رات کو جسم کے دائیں جانب دماغی جریان خون کے باعث فالج کا شدید حملہ ہوا۔ ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء اتوار صبح ساڑھے نو بجے پیکِ اجل کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رہے۔ ۱۸۹۸ء میں بی اماں نے مولانا محمد علی کو مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجا۔ وہاں سے واپس آکر انہوں نے اور بڑے بھائی شوکت علیؒ نے کچھ عرصہ ریاست بڑودہ کی ملازمت کی اس کے بعد جب دونوں بھائیوں نے ملکی سیاست

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لبیک کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ سارے عالمِ اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لاش بیت المقدس لے جاکر دفن کی گئی۔ اس موقع پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

یک نفس جانِ نزارا و تپید اندر فرنگ	تا شرہ بر ہم زنیم از ماہ و پروین درگزشت
اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم	از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت	سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت

مولانا محمد علی شاعری میں جوہر تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ زیادہ تر میر تقی میرؔ، غالبؔ اور امیر مینائیؔ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں تصوف کے مسائل، فلسفے کے دقائق، عشق کی سرمستیاں، غم واندوہ کی کلفتیں، مسرتوں کی لذتیں اخلاق کے سبق وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ اس میں صنائع و بدائع بھی ہیں۔ زبان میں سادگی سلاست اور بے ساختگی کے ساتھ لطافت و حلاوت بھی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار جذبۂ ملی کے عکاس ہیں اور ان میں اسلامی عقائد نظریات اور اصول کی ترجمانی کی گئی ہے ان کے بعض اشعار سہلِ ممتنع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا دیوان ۱۹۵۰ء میں "گنجینۂ جوہر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

دشمنوں سے تلطف ہے تو کچھ — دوستوں سے بھی مدارا چاہیے

قیدِ تنہائی کا لذت آشنا — کیسے کہہ دوں تارکِ لذات ہے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا تو بی اماں کی دعائیں بھی ان کے شامل حال رہیں۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد برطانوی سامراج نے خلافت عثمانیہ ترکی کو اپنی ہوس ملک گیری کا نشانہ بنایا اور اندرونی و بیرونی سازشوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گراں باری کا — تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد — ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

ہے رشک کیوں یہ ہم کو بہ مہرداد دیکھ کر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہر سینہ آج ہے ترے پیکاں کا منتظر — ہو انتخاب اسے نگہِ یار دیکھ کر

جب اپنی جوانی پہ آ گئی دنیا — تو زندگی کے لیے آخری نظام آیا

ہے سنّتِ اربابِ وفا صبر و توکّل — چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور — جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

ہے مسلماں کی بس یہی پہچان — کہ فقط اک خدا سے ڈرتا ہے

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بُلا بھیجیں — بھیجی ہیں دُرودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ذریعے "خلافت" کا خاتمہ کر دیا تو ہندوستان کے مسلمانوں میں غم اور غصّے کی لہر دوڑ گئی۔ ترکی جنگ میں شدید نقصان اٹھا چکا تھا۔ ہندی مسلمانوں نے طبی مشن، دواؤں اور روپے کی صورت میں ان کی مقدور بھر امداد کی اور خلافت

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

۲۔ مولانا شوکت علیؒ، مولانا محمد علیؒ کے بڑے بھائی تھے۔ محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کے گریجویٹ اور کرکٹ کے نہایت اچھے کھلاڑی تھے۔ ایک عرصے تک مذکورہ کالج کی کرکٹ ٹیم کے کپتان رہے۔ بڑے بیحم شحیم گرانڈیل اور دیو قامت آدمی تھے کالج سے فارغ ہونے کے بعد محکمہ افیون میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کا چرچا ہوا تو لمبی چھٹی لے کر سر آغا خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری بن گئے اور ہندوستان بھر میں دورے کرتے رہے۔ پھر قومی یا ملّی کام کرنے کے لیے پنشن لے لی اور چھوٹے بھائی کے دست و بازو بن گئے۔ ان کو علم و فضل میں مولانا محمد علی سے کوئی نسبت نہ تھی بلکہ فی الحقیقت وہ نہ عالم تھے اور نہ مقرر — مگر راہِ حق کے جانباز مجاہد تھے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "وہ کسی حال میں ناامید نہ ہوتے تھے۔ ان کی تقریر چند فقروں کی ہوتی تھی مگر وہ فقرے لوگوں میں روح پھونک دیتے تھے اور اپنے ساتھیوں کو بھی کبھی ناامید نہ ہونے دیتے تھے۔" مولانا محمد علیؒ سے سات آٹھ برس بڑے تھے اور ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ سیاست میں آنے کے بعد تو دونوں بھائی "یک جان دو قالب" ہو گئے۔ سفر ہو یا حضر، قید خانہ ہو یا گھر وہ ساتھ ساتھ ہی ہوتے تھے۔ اسی لیے یہ دونوں "علی برادران" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے حالانکہ ان کے اور بھائی بھی تھے۔ قابلیت اور علم و فضل کے اعتبار سے بلاشبہ مولانا محمد علی کو ان پر فوقیت حاصل تھی لیکن خدا پرستی، غیرتِ دینی، حمیتِ اسلامی، روحِ ایثار اور بہادری و بے باکی کی خوبیاں دونوں بھائیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر موجود تھیں۔ ملّی کاموں کے لیے چندہ مانگنے میں مولانا شوکت علی کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی بحالی کے لیے زبردست تحریک چلائی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علیؒ اور مولانا شوکت علیؒ نے بی اماں کے ساتھ مل کر ملک کے طول و عرض میں وسیع دورے کیے اور مسلمانوں کی غیرت کو جھنجھوڑا۔ وسط ستمبر ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علیؒ، مولانا شوکت علیؒ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ید طولیٰ حاصل تھا جس سے چندہ مانگا اس سے کچھ نکلوا کے ہی دم لیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں وہ بھی مولانا محمد علیؒ کے ساتھ چار سال نظر بند رہے۔ مشہور مقدمۂ کراچی میں بھی انہوں نے دو برس کی سزا پائی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ انگلستان گئے۔ ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو مولانا محمد علی فوت ہوئے تو ان کی لاش کو بیت المقدس لے جاکر دفن کیا۔ وطن واپس آکر پھر خلافت کے کام میں جٹ گئے اور بمبئی سے "خلافت" نام کا ایک اخبار بھی نکالتے رہے۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا غلغلہ بلند ہوا تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے نہایت پُرجوش اور جاں نثار معاون ثابت ہوئے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ قائدِ اعظمؒ ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کے کام کو بہت سراہتے تھے۔

۲۸ نومبر سنہ ۱۹۳۸ء کو دِلّی میں وفات پائی۔ ان کے انتقال پر قائدِ اعظمؒ فرطِ جذبات سے کئی گھنٹے روتے رہے اور بڑے درد سے فرمایا:

"میرا وہ رہنما جس کی دلپذیر شخصیت پر مجھے ناز رہا افسوس وہ آج چل بسا۔ وہ پوری سنجیدگی اور خلوص سے ہماری جماعت میں شامل ہوئے اور بلاشبہ وہ ایک دلیر اور بہادر انسان تھے۔"

مولاناؒ کی تدفین کے وقت قائدِ اعظمؒ جامع مسجد دِلّی کی سیڑھیوں پر دو تین گھنٹے دھوپ میں بیٹھے رہے اور انہیں دفن کرنے کے بعد ہی وہاں سے رخصت ہوئے۔

(معاصرین۔ یادِ رفتگان۔ ہمدردِ صحت ڈائجسٹ کراچی دسمبر ۱۹۶۶ء۔ معارف لاہور مختلف شمارے)

اور کچھ دوسرے مسلمان رہنماؤں کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کا حکم دیا۔ اس مقدمے کی سماعت کراچی کے خالق دینا ہال میں ۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء کو شروع ہوئی اور یکم اکتوبر ۱۹۲۱ء تک جاری رہی۔ اسی زمانے میں کسی صاحبِ دل نے "صدائے خاتون" کے نام سے ایک نظم لکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئی۔ فنی لحاظ سے اس نظم میں کچھ اسقام ہیں لیکن اس نے ملک بھر میں جو مقبولیت حاصل کی اس کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ یہ پوری نظم نایاب تو نہیں لیکن کمیاب ضرور ہے اس لیے ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔

صدائے خاتون

(۱)

بولیں اماں محمدؐ علی کی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۲)

ہو تمہیں میرے گھر کا اُجالا | تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلیٰ | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۳)

اے مرے لاڈلو، اے میرے پیارو | اے مرے چاند اے میرے تارو
میرے دل اور جگر کے سہارو | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۴)

صبر سے جیل خانے میں رہنا[1] | جو مصیبت پڑے اس کو سہنا
کیجیو اپنی اماں کا کہنا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۵)

---

[1] بعض نے یہ مصرعہ اس طرح لکھا ہے:۔ جیل خانے میں خوش ہو کے رہنا

(۵)

ہتھکڑی تو ہے مردوں کا گہنا | جانگیہ تم نے کمبل کا پہنا
آدھی ٹانگوں سے بالکل برہنہ | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۶)

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا | کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورا اس امتحان میں اترنا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۷)

گر ذرا سست دیکھوں گی تم کو | دودھ ہرگز نہ بخشوں گی تم کو
میں دلاور نہ سمجھوں گی تم کو | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۸)

میرے بچّوں کو مجھ سے چھڑایا | دل حکومت نے میرا دُکھایا
اس بڑھاپے میں مجھ کو ستایا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۹)

میرے بچّوں کو پکڑا سفر میں | کس طرح چین ہو مجھ کو گھر میں؟
خاک دنیا ہے میری نظر میں | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۰)

اب مری حق سے فریاد ہو گی | غیب سے میری امداد ہو گی
میری محنت نہ برباد ہو گی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۱)

ہوتے میرے اگر سات بیٹے | کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمدؐ کے رستے | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۲)

کا ہے پانی خوشی ہو کے جانا | سجدۂ شکر میں سر جھکانا
میں پڑھوں گی خدا کا دوگانا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۳)

پھانسی آئے اگر تم کو جانی | مانگنا مت حکومت سے پانی
بات رکھ لیجیو خاندانی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۴)

حشر میں حشر برپا کروں گی | پیش حق تم کو لے کر چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۵)

دین و دنیا میں پاؤ گے عزت | سب کہیں گے شہید خلافت
اے محمدؐ علی اور شوکت | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

(۱۶)

آج اسلام نرغہ میں آیا | ظلم کفار نے مل کے ڈھایا
چین یاسین ہم نے نہ پایا | جان بیٹا خلافت پہ دے دو

---

۴ نومبر ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کے پانچوں ساتھیوں (مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا نثار احمد کانپوریؒ، مولانا غلام مجدد سرہندیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو مرحوم اور سوامی شنکر اچاریہ) کو دو دو سال کی قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ اسی زمانے میں یٰسین نام یا تخلص کے انہی صاحب نے جنہوں نے "صدائے خاتون" لکھی تھی ایک اور دردناک نظم "صدائے مظلوم" کے عنوان سے لکھی۔ یہ نظم بھی عوام میں بے حد مقبول ہوئی اور ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔[لہ]

لہ نظم "صدائے مظلوم" یہ تھی:

(۱)

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی | ہم تو جلتے ہیں دو دو برس کو
آبرو حق کے رستے میں دے دی | ہم تو جلتے ہیں دو دو برس کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بی اماں نے اپنے پیارے فرزندوں کی قید کا زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا۔ ایک دفعہ یہ خبر مشہور ہوگئی کہ مولانا محمد علی (بعض دوسرے لوگوں کی طرح) معافی مانگ کر جیل سے رہا ہو جائیں گے۔ بی اماں نے یہ خبر سنی تو غضبناک ہوگئیں او

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۲)

لو، سزا بے گناہوں نے پائی! | آج ہوتی ہے تم سے جدائی!
سارے ہندو مسلمان بھائی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۳)

قید سے ہم جو جیتے بچیں گے | بھائیو تم سے پھر آملیں گے
صبر سے شکر سے ہم رہیں گے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۴)

تم ہمیں یاد کر کے نہ رونا! | آنسوؤں سے نہ دامن بھگونا
مل کے سوراج کا بیج بونا! | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۵)

کام مل کر خلافت کا کرنا! | جز خدا کے کسی سے نہ ڈرنا!
حق کے رستے پہ کچھ کر گزرنا! | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۶)

جرم ہم نے بس اتنا کیا تھا | دین احمدؐ کا فتویٰ دیا تھا
کیا حکومت کا اس میں برا تھا | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۷)

بات قرآن کی جب بتائی | یہ سزا اس کے بدلے میں پائی
مل کے سب دو خدا کی دہائی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بولیں: "نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ محمدؐ علی اسلام کا سپوت ہے وہ انگریزوں سے معافی مانگنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا اور اس نے یہ حرکت کی تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

(۸)

بات ہم نے کہی تھی جو سچی | اس کے بدلے میں پِسیں گے چکی
کس کی تقدیر ہے ہم سے اچھی | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۹)

ہائے سچی شریعت کے عالِم! | ہائے دینِ محمدؐ کے خادم!!
دشمنوں کے بنے آج مجرم | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۰)

ہیں مسلمان سب جان کھوتے | آسماں پر فرشتے ہیں روتے
صبر کر لیں بڑے اور چھوٹے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۱)

کچھ نہیں بال بچوں کا غم ہے | پر خلافت کا ہم کو اَلَم ہے
بس اسی واسطے چشم نم ہے | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۲)

بے خطا تھے سزا پا رہے ہیں | بے گنہ قید میں جا رہے ہیں
ہم کو اغیار کلپا رہے ہیں | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۳)

دینِ حق کی حمایت کی خاطر | اور پیاری خلافت کی خاطر
اس نبیؐ کی امانت کی خاطر | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۴)

تم کو محلوں میں رہنا مبارک | بسترا اور بچھونا مبارک
جیل کا ہم کو کونا مبارک | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میرے بوڑھے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔
ایسی زندگی جس سے اسلام پر حرف آئے، لعنت ہے۔"
بی اماں اپنے لباس کے لیے خود سوت کاتا کرتی تھیں۔ ان کا لباس

(۱۵)

عیش دنیا کے تم کو مبارک | خوان سب نعمتوں کے مبارک
ہم کو فاقہ یہ فاقہ مبارک | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۶)

تم کو تہذیب لیٹے مبارک | تم کو ریشم کے کپڑے مبارک
ہم کو کمبل کے ٹکڑے مبارک | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۷)

ہتھکڑی تو ہے مردوں کا گہنا | جانگیہ ہم نے کمبل کا پہنا
آدھی ٹانگیں ہیں ننگی برہنہ | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

(۱۸)

ہے سلام آخری یہ ہمارا | کر دیا سینہ تم آشکارا
قید میں ہم کریں گے گزارا | ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

ایک فاضل بزرگ کنور اعظم علی خان خسروی نے "العلم" کراچی کے شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۴ء میں لکھا ہے کہ:

"یہ دونوں نظمیں (خاص طور پر صدائے خاتون) اس زمانے میں اتنی مقبول تھیں کہ دور افتادہ دیہات کی ناخواندہ عورتوں تک جنہیں سیاسی تو کیا سماجی شعور تک نہ تھا انہیں لکھ لکھ کر یا حفظ کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اس مقصد میں تعاون کے لیے ان کے مرد شہر سے اپنے خطوط میں یہ منظومات لکھ کر یا لکھوا کر انہیں بھیجا کرتے ...... میں نے خود یوپی کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے دیہات کی ہندو اور مسلمان اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی عورتوں کو

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لمبے کرتے، چوڑی دار پاجامے اور ایک دوپٹے پر مشتمل ہوتا تھا۔ بوڑھی اور کمزور ہونے کے باوجود وہ شہر شہر جا کر تقریریں کرتیں۔ ان کی تقریروں کا موضوع صرف اسلام اور آزادی ہوتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتیں:

"دنیا کے تمام مسلمان مجھے ایسے ہی عزیز ہیں جیسے محمدؐ علی اور شوکت علی۔"

۱۹۲۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں حکیم اجمل خانؒ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ بی اماں نے اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"بیٹو! میں نے برقع اتار دیا ہے اس لیے کہ اس ملک میں اب کسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یہ نظمیں (خصوصاً صدائے خاتون) تقریبات میں اور ویسے عام طور پر بھی بطور گیت کے ڈھولک پر گاتے سنا تھا۔"

"صدائے مظلوم" کے چھٹے اور آٹھویں بندوں میں جو تلمیحات ہیں جناب خسروی نے ان کی توضیح اس طرح کی ہے:

"۸ تا ۱۰ ستمبر ۱۹۲۱ء کو کراچی کی بندر روڈ عیدگاہ میدان میں منعقدہ کل ہند خلافت کانفرنس کے عوامی اجتماع میں ۹/۹/۲۱ کو پورے ہندوستان کے کم و بیش پانچ سو مقتدر علمائے دین کے اس متفقہ فتوے کا اعلان کیا گیا کہ چونکہ انگریز آج کل ترکوں سے برسرپیکار ہیں لہٰذا انگریزی فوج میں ملازمت یا اس جنگ کے سلسلے میں انگریزوں کے ساتھ دامے درمے قدمے سخنے کسی بھی نوع کا انفرادی یا اجتماعی تعاون ازروئے قرآن و سنت و اجماع و قیاس خلافِ اسلام ہے اور پھر ۱۱/۹/۲۱ کو مولانا جوہر نے اپنے اختتامی خطبۂ صدارت میں انتہائی پُرزور و مؤثر انداز میں اس متفقہ فتوے پر عمل کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو دعوت دی تھی۔ اسی خطبۂ صدارت پر مولانا اور ان کے رفیقوں کے خلاف مسلمان فوجیوں میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر اس مقدمہ کا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا اور دورانِ مقدمہ میں مولانا نے استغاثہ کے جواب میں وہ معرکہ آرا مدلل اور مسکت تقریر کی جس میں اپنے موقف پر شد و مد سے اصرار کرتے ہوئے اس سرکاری الزام کی توثیق کی تھی۔"

کی آبرو باقی نہیں رہی۔ میں نے ۱۸۵۷ء میں اپنے جھنڈے کو لال قلعہ سے اترتے دیکھا۔ اب میری تمنا ہے کہ بدیسی جھنڈے کو لال قلعے سے اترتے دیکھوں۔"

بی اماں نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ سفر ہو یا حضر پنجگانہ نمازوں کے علاوہ تہجد کی نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتیں۔ دینی کتابیں اور اخبارات دوسروں سے پڑھوا کر سنا کرتی تھیں۔

۱۱ مارچ ۱۹۲۴ء کو بی اماں کو اپنی پیاری پوتی آمنہ بنت مولانا محمد علی کی موت کا صدمہ جھیلنا پڑا۔ اس کے چند ماہ بعد ۱۲ اور ۱۳ نومبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب کو ۲ بج کر ۱۰ منٹ پر دہ خود بھی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں ــــــ

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

(سیرۃ محمد علی۔ "العلم" کراچی اپریل تا جون ۱۹۸۴ء و اکتوبر تا دسمبر ۸۴ء، پہچان کراچی جنوری ۱۹۸۶ء۔ مسلمان خواتین کی دینی و علمی خدمات)

صاحبزادی احمدی بیگم

والئ میسور سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹ء) کے بعد ان کے خاندان کو انگریزوں نے کلکتہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد مرزا لقی علی تھے جو سلطان ٹیپو شہید کے پوتے تھے۔ صاحبزادی احمدی بیگم انہی مرزا لقی علی کی بیٹی تھیں۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی اس کے ساتھ ہی تعلیم و تربیت کا ایسا اہتمام کیا گیا کہ وہ ایک سچی مسلمان بنیں اور مشرقی اقدار پر کاربند رہیں۔ چنانچہ وہ نہایت اعلیٰ اخلاق و کردار کی مالک بنیں۔ ان کی شادی بنگال کے مشہور سہروردی خاندان میں ہوئی۔ خاوند کا نام (علامہ سر) عبداللہ المامون سہروردی تھا۔

صاحبزادی کے میکے میں سارا کام کاج ملازم کرتے تھے اور اہل خانہ تنکا بھی نہیں توڑتے تھے لیکن سسرال میں بالکل مختلف ماحول تھا۔ ملازم تو یہاں بھی تھے لیکن خانہ داری کا بیشتر کام خواتین کو خود کرنا پڑتا تھا۔ صاحبزادی صاحبہ نے خوش دلی کے ساتھ اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیا اور گھر کا کام کاج خود انجام دینے لگیں۔ وہ بڑی دیندار اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے شوہر (سر عبداللہ المامون) ان کو اپنے ساتھ انگلستان لے گئے۔ جب تک وہاں مقیم رہیں کبھی کسی حرام اور مشکوک چیز کو دسترخوان کے قریب نہ آنے دیا اور مسلسل انڈوں اور توس پر گزارہ کرتی رہیں۔ صبر و قناعت اور عزم و ہمت بھی ان کی کتاب اخلاق کے روشن ابواب تھے۔ پہلے شوہر کا انتقال ہوا پھر والد نے وفات پائی مگر انہوں نے بڑے عزم اور حوصلے سے کام لیا اور زندگی کے معمولات پہلے کی طرح انجام دیتی رہیں۔ ملک تقسیم ہوا اور مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے ڈھاکہ آئیں۔ ان کی سابقہ زندگی شاندار حویلیوں میں گزری تھی لیکن ڈھاکہ میں انہیں صرف دو کمروں کا مکان ملا۔ اسی میں باقی زندگی صبر و شکر کے ساتھ گزار دی۔ کبھی زبان پر شکوہ یا شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا ہمیشہ راضی برضا رہیں۔

(نیک بیبیاں)

بی بی مقبول النّساء بیگم

نامور سیاسی رہنما جناب حسین شہید سہروردی مرحوم کی نانی اور ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی کی دادی تھیں ــــ ان کی شادی بحرالعلوم مولانا عبیداللہ العبیدی سہروردی پرنسپل (سپرنٹنڈنٹ) مدرسہ عالیہ ڈھاکہ سے ہوئی۔ وہ اردو اور فارسی کے بلند پایہ مصنّف اور نغزگو شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "دیوان عبیدی" کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۸۸۶ء میں چھپا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ ڈھاکہ کے بارے میں ان کا قصیدہ فارسی کی بہترین منظومات میں شمار ہوتا ہے۔

مولانا عبیداللہ العبیدی ۱۸۸۵ء میں اکاون برس کی عمر میں فوت ہوگئے۔ انہوں نے اپنے پیچھے کئی بچے چھوڑے۔ ان کی پرورش اور تربیت کا سارا بوجھ بی بی مقبول النّساء بیگم پر آن پڑا۔ ان کے دیور نے مرحوم بھائی کی اولاد کی کفالت کرنا چاہی مگر انہوں نے یہ بات منظور نہ کی۔ وہ بڑی عالمہ فاضلہ، خوددار، دانا اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی وسیع حویلی فروخت کردی اور چھوٹے سے مکان میں منتقل ہوگئیں۔ بی بی مقبول النّساء بیگم نے اپنے بچوں کی تعلیم تربیت کس طرح کی، اس کی کیفیت ان کی لائق پوتی بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اس طرح بیان کی ہے: ــــــــــ

"اماں اولاد کی سخت نگرانی کرتی تھیں۔ قطعاً کوئی نرمی نہیں برتتی تھیں۔ یہ مجال نہ تھی کہ کوئی بچہ غروب آفتاب سے قبل گھر نہ آجائے۔ شام کو بچوں کو جمع کرکے وہ تذکرۃ الانبیاء اور دوسری مذہبی کتابیں سنایا کرتی تھیں۔ جب وہ بڑے ہوجاتے تھے تو ان کو فارسی زبان پڑھاتی تھیں۔ فردوسی کا شاہنامہ پڑھاتی تھیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات سناتی

تھیں۔ صحتِ زبان کا ان کو بہت خیال تھا۔ بچوں کے شین قاف درست کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھاکہ کے قریب ایک گاؤں میدنی پور میں رہنے والے بچے فصیح اردو بولتے تھے جو کسی طرح لکھنؤ کی زبان سے کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان کے عادات و اخلاق کو بھی سنوارتی تھیں۔ اس تربیت کا اثر یہ تھا کہ جب بڑے ہو کر ان کے بچے مزید تعلیم کے لیے انگلستان گئے تو مجال کیا کہ کسی بچے نے سگریٹ کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اس تربیت کا یہ اثر تھا کہ اولاد اپنی ماں کی عزت اس طرح کرتی تھی جس طرح ایک مخلص مرید اپنے مرشد کی کرتا ہے۔"

(نیک بیبیاں)

صغریٰ بی بی

مولوی عبدالعزیز بہاری مرحوم کی اہلیہ تھیں۔ نہایت صالحہ، مخیرّ اور علم دوست خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی لاکھوں روپیہ کی جائداد (جس کی مالیت موجودہ زمانے کے لحاظ سے کروڑوں روپے تک پہنچتی ہے) اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ ماہوار (جس کی مالیت اب ایک کروڑ روپیہ سے بھی زائد ہے) کی مستقل آمدنی مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور رفاہِ عامہ کے دوسرے کاموں کے لیے وقف کر دی۔ یہ کارنامہ قیامت تک ان کا نام زندہ رکھے گا۔ صغریٰ بی بی مدت ہوئی، وفات پا چکی ہیں۔

(مشاہیرِ زنان)

بی بی خجستہ اختر بانو

بحرالعلوم مولانا عبید اللہ العبیدی سہروردی مرحوم کی صاحبزادی اور مشہور سیاسی رہنما جناب حسین شہید سہروردی مرحوم سابق وزیراعظم پاکستان کی والدہ تھیں ——— خجستہ اختر بانو کی عمر ابھی گیارہ برس کی تھی کہ ان کے والد جو مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے پرنسپل تھے، فوت ہو گئے۔ والدہ مقبول النساء بیگم بڑی حوصلہ مند اور باہمت خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ خجستہ اختر بانو نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی زبان میں آنرز کیا اور یونیورسٹی بھر میں اوّل رہیں۔ حکومت نے ان کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔ خجستہ اختر بانو کو فارسی کے علاوہ عربی، اردو، بنگالی اور انگریزی زبانوں پر بھی پورا عبور حاصل تھا اور وہ یہ تمام زبانیں روانی سے بول سکتی تھیں۔ اردو کی تو وہ بہت اچھی انشاء پرداز تھیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے "ولادتِ نبویؐ" کے موضوع پر ایک کتاب "کوکب دری" بھی لکھی۔ اگرچہ انہوں نے مشرقی علوم کے ساتھ نہایت اعلیٰ مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر اپنی معاشرت میں وہ قدیم مشرقی تہذیب کی دلدادہ تھیں اور مغربی طرزِ معاشرت سے ان کو قطعاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بڑی دیندار اور منکسر المزاج خاتون تھیں۔ ان کی گفتگو اور سادہ لباس سے قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ پردہ کی بھی سختی سے پابندی کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ منٹو کی لیڈی نے ان سے ملاقات کرنی چاہی لیکن انہوں نے وائسرائے ہاؤس میں جانے سے معذرت کر دی۔ چنانچہ لیڈی منٹو نے خود ان کے گھر آ کر ان سے ملاقات کی۔

ایک دفعہ بھوپال کی والیہ نواب شاہجہان بیگم نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھوپال کی حکومت میں کوئی بڑا عہدہ قبول کرلیں لیکن بی بی خجستہ اختر بانو نے شکریے کے ساتھ ملازمت کرنے سے معذرت کردی۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی بہت اعلیٰ تعلیم دلائی اور ان کی تربیت نہایت عمدگی سے کی۔ خجستہ اختر بانو کی شادی سر زاہد سہروردی سے ہوئی تھی۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ بعد ازاں اپنی قانونی صلاحیتوں کی بنا پر دورِ شباب ہی میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوگئے اور آخر عمر تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ (مشاہیر نسواں - نیک بیبیاں)

بی بی بختیہ رح

یہ نیک بی بی مصر کے قصبے مطیعہ کی رہنے والی تھیں۔ بہت عبادت گزار اور مخیر تھیں۔ انہوں بہت مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا، اس لیے حاجہ بختیہ کے نام سے مشہور ہوگئیں۔ والد کا نام سید محمود تھا جو حضرت علیؓ کی اولاد سے تھے۔
بی بی بختیہ رح نے مطیعہ میں ایک نہایت عالی شان مسجد تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ بہت سی زمین بھی وقف کی (رجب ۱۳۱۹ھ ہجری)۔ اس وقف کی آمدنی سے نہ صرف مسجد مذکور کا بلکہ اس کے ساتھ ملحق عالیشان دینی مدرسے کا خرچ بھی نکالا جاتا ہے۔ باقی آمدنی سے سیوط کے مدرس علماء کو وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ حاجہ بختیہ نے "انجمن خیریہ اسلامیہ" (مصر) کو بھی ایک بہت بڑی رقم اس مقصد کے لیے عطا کی کہ اسے فقیروں اور حاجتمندوں کے بچوں کی تربیت پر صرف کیا جائے۔ حاجہ بختیہ کے ایسے نیک کاموں کی وجہ سے مصر میں ان کی نہایت تعظیم و توقیر کی جاتی تھی اور اب بھی ان کو بہت اچھے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بی بی بختیہ کا سالِ وفات معلوم نہیں ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ساٹھ ستر سال پہلے وفات پائی۔ (مشاہیر نسواں)

بدر النّساء بیگم

اردو کے نامور محقّق، مؤرّخ اور ادیب نصیر الدین ہاشمی مرحوم (حیدرآباد۔ دکن) کی والدہ تھیں۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۵ء میں مدراس میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق دکن کے ایک مشہور علمی اور دینی گھرانے سے تھا۔ قاضی بدر الدولہ جو دکن میں ایک نامور مبلّغ اسلام اور عالمِ دین گزرے ہیں، بدر النّساء بیگم کے دادا تھے۔ ان کی شادی بھی حیدرآباد (دکن) کے ایک معزز علمی خاندان میں ہوئی۔ نصیر الدین ہاشمی ان کے بطن سے ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ بدر النّساء بیگم کے بچّے ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے بڑی ہمت اور استقامت سے اس صدمے کو برداشت کیا اور بچوں کی تعلیم و تربیت نہایت عمدگی سے کی۔ وہ بڑی دیندار، عالمہ فاضلہ ذہین اور طبّاع خاتون تھیں۔ اردو ادب سے خاص شغف تھا۔ کئی کتابیں تصنیف کیں ان میں سے دو کتابیں "ممالکِ اسلامیہ کی سیر" اور "گلزارِ اولیاء" بہت مقبول اور مشہور ہوئیں۔ ان کے شوہر نے خاصی جائداد اپنے پیچھے چھوڑی تھی۔ بدر النّساء بیگم نے اس جائداد کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے کیا۔ سارے حساب کتاب کی پڑتال خود کیا کرتی تھیں اور باپردہ ہونے کے باوجود زمینوں کی نگرانی کا کام بھی خود انجام دیتی تھیں۔ اُن کو باغبانی کا بہت شوق تھا۔ حیدرآباد (دکن) میں ایک وسیع قطعہ اراضی خرید کر اس میں ایک شاندار باغ لگوایا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک نمونہ کا باغ تھا۔ جب تک یہ باغ تیار نہ ہو گیا وہ ہر مرحلے پر اس کی ذاتی نگرانی کرتی رہیں۔[1]

---

[1] تذکرہ "مشاہیر نسواں" میں "ثمرات الفنون" کے حوالے سے "بدر النّساء بیگم" نام کی ایک خاتون کے حالات ان الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں۔

"حیدرآباد (دکن) کی ایک نیک کردار بیگم ہے۔ اس نے حجاز ریلوے کے لیے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ والدہ کی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ نصیر الدین ہاشمی اردو کے نامور محقق بنے۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دکن میں اردو" تصنیف کی۔ سرکار آصفیہ نے اس کتاب کی تالیف کے صلہ میں انہیں ۱۹۲۸ء میں ایک سال کے لیے یورپ بھیجا جہاں انہوں نے دکنی ادبیات سے متعلق مواد فراہم کرنے کے علاوہ وہاں کی اردو کیٹا لاگوں کی تصحیح بھی کی اور وہاں سے واپس آکر اپنی مشہور کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" تصنیف کی۔ اس کتاب میں انہوں نے ان دکنی مخطوطات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جو انگلستان اور پیرس وغیرہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس میں قدیم دکنی مصنفین کے حالات نمونۂ کلام کے ساتھ اور مختلف نسخوں میں اختلافات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اردو لٹریچر کا کوئی محقق اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہاشمی صاحب نے اور بھی بہت سی بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں۔

بدر النساء بیگم نے ادبی اور علمی دنیا میں اپنے سعادت مند بیٹے کا عروج دیکھ کر کوئی نصف صدی پہلے وفات پائی۔ نصیر الدین ہاشمی بھی طویل عمر پاکر خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ چکے ہیں۔

(مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات۔ مصنفینِ اردو)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

ایک معقول چندہ بابِ عالی کو روانہ کیا۔ جس کے صلے میں سلطان نے ایک طلائی تمغہ عنایت فرمایا۔"

یہ محقق نہیں ہو سکا کہ یہ بدر النساء بیگم، نصیر الدین ہاشمی کی والدہ تھیں یا کوئی اور خاتون تھیں۔

محترمہ محمود بیگم

نواب شرف الدین خاں رئیس دہلی کی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب موصوف شاہ اکبر ثانی (۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء تا ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء) کے وزیر اعظم نواب زین العابدین کے پوتے تھے اور سر سید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی۔ وہ عالم فاضل آدمی تھے اور اہل علم کی بے حد قدر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اس دور کے ایک جید عالم دین مولانا محمد اسحٰق رامپوری[1] کو مامور فرمایا۔ چنانچہ محمود بیگم نے بھی مولانا محمد اسحٰق سے تعلیم پائی اور جملہ علوم دینی میں طاق ہو گئیں۔ ان کا گھرانا دہلی کے علمی گھرانوں میں ممتاز مقام رکھتا تھا اس لیے ان کو اردو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ محاسن اخلاق کے اعتبار سے بھی وہ اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کا اصل نام شاید کچھ اور تھا مگر مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری مرحوم (صاحب "البرامکہ" و "نظام الملک طوسی") نے اپنی کتاب "یادِ ایام" میں ان کا ذکر محمود بیگم کے نام سے

---

[1] مولانا محمد اسحٰق بیس سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ حکیم مومن خاں مومن سے ملنے رامپور سے دلی آئے۔ والد تو واپس چلے گئے مگر مولانا گلی حکیم مومن خاں کی مسجد میں مقیم ہو گئے۔ نواب شرف الدین خاں نے ان کی علمی قابلیت کا حال سنا تو انہیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا اور اپنے کتب خانے کا کمرہ ان کو رہنے کے لیے دے دیا۔ مولانا نے ایک طرف تو نواب صاحب کے بچوں اور پوتوں کی تعلیم و تربیت کی اور دوسری طرف اس کتاب خانے سے خوب استفادہ کیا۔ مولانا کو اللہ نے دینی علوم کے علاوہ منطق و فلسفہ اور ریاضی میں بھی درجۂ کمال عطا فرمایا تھا۔ مشہور مؤرخ اور ماہر ریاضی شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی بعض اوقات اپنے بیٹے رضاء اللہ (انجینئر) کو مولانا کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے کہ اس سوال کو مولانا سے حل کرا کے

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا ہے اس لیے یہاں بھی ان کا ذکر اسی نام سے کیا جا رہا ہے ــــ ان کی شادی سر سید احمد خاں کے لائق فرزند جسٹس سید محمود سے ہوئی۔ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں ان کے بطن سے سر سید راس مسعود پیدا ہوئے۔ ان کی رسم بسم اللہ اسٹریچی ہال علی گڑھ میں ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء میں ہوئی۔ اس کے بعد مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ پہلے بغدادی قاعدہ پڑھایا گیا، "راہِ نجات" سے دینی مسائل حفظ کرائے گئے۔ گلستاں بوستاں پڑھائی گئیں۔ حروف کی تشریح بتائی گئی، ساتھ ہی ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دی جاتی رہی۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ)

لائے۔ ان کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ نے ان کو اپنے مدرسے میں فلسفہ اور منطق پڑھانے کے لیے لگا لیا تھا۔

مولانا محمد اسحٰقؒ بڑے درویش صفت اور خود دار انسان تھے۔ کسی کے گھر پڑھانے نہیں جاتے تھے اور گھر آکر پڑھنے والوں سے پیسہ نہیں لیتے تھے۔ ملا واحدی دہلویؒ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۰۴ء میں مولانا نے ایک دوست کی خاطر "تفسیر کبیر" کا ترجمہ لکھوانا شروع کیا۔ ۱۹۰۵ء میں امیر حبیب اللہ خاں شاہِ افغانستان ہندوستان تشریف لائے۔ ان دوست نے کہا "تفسیر کا ترجمہ امیر صاحب کے نام معنون کر دیا جائے تو کیسا ہے"، مولانا ترجمہ لکھواتے رک گئے، فقرہ بھی ادھورا چھوڑا اور فرمایا:

> "تفسیر کبیر اور محمدؐ اسحاق دونوں کی تم نے بھلی قدر کی، میاں! یہ کام اب مجھ سے نہ ہوگا۔"

ڈھائی سو صفحے فلسکیپ سائز کے تیار تھے، اسی وقت پھاڑ ڈالے۔

مولانا محمدؐ اسحٰقؒ نے نوے سال کی عمر پائی۔ عمر بھر مجرد رہے۔ جس کمرے میں اوّل روز آکر بیٹھے تھے اور جس پلنگ پر اوّل شب سوئے تھے اسی کمرے میں اور اسی پلنگ پر وفات پائی۔ (ہمدرد صحت ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۰ء)

اس ساری تعلیم کی نگرانی محمود بیگم نے کی۔ سید راس مسعود کی تعلیم و تربیت اور ان کی والدہ کے بارے میں مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری ؒ "یادِ ایام" میں لکھتے ہیں:

"سید مسعود کا عہدِ طفلی، سر سید احمد خاں، سید مسعود اور محمود بیگم کے سایۂ عاطفت میں گزرا لیکن (ان کی) تعلیم و تربیت میں سید محمود کی والدہ کا حق سب پر فائق ہے۔ یہ وہ دہلوی بی بی ہیں جن کی ذات پر نہ صرف دِلّی بلکہ ہندوستان کو فخر ہے۔ عورتوں کے لیے جو مخصوص صفات ہیں ان کے علاوہ اردو علم و ادب میں یہ بہت ممتاز ہیں، سر سید کو اردو کے جس کسی لفظ یا محاورے میں شک ہوتا تو وہ اپنی بہو سے دریافت کرتے تھے اور سید مسعود نے یہ خدمت اکثر ادا کی ہے۔ ولایت جانے سے قبل دس سال کی عمر تک محمود بیگم نے اپنے بچّہ کا قرآن ختم کرا دیا تھا اور اردو کا بہترین کلام بھی حفظ کرایا تھا۔"

یہ والدہ کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ سر راس مسعود کو عمر بھر دین اور علم و ادب سے گہرا لگاؤ رہا۔ چنانچہ حکیم الامت علامہ محمدؐ اقبال ؒ، مولانا سید سلیمان ندوی ؒ اور بے شمار دوسرے اربابِ فضل و کمال ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔

محمود بیگم کے شفیق خسر سیّد احمد خان نے ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں اور شوہر سیّد محمود نے ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میں وفات پائی۔ ان صدموں کو انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے جھیلا اور سیّد راس مسعود کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ لائق فرزند نے بھی دنیوی لحاظ سے بڑا عروج حاصل کیا۔ وہ اپنی والدہ کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ افسوس کہ محمود بیگم کا یہ لائق جگر گوشہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۳۵۵ھ (۳۰ جنوری ۱۹۳۷ء) کو ان کی زندگی ہی میں بمقام بھوپال اس عالمِ فانی سے عالمِ بقا کو سدھار گیا۔ محمود بیگم اس وقت علی گڈھ میں تھیں۔ میّت انہی کی کوٹھی پر علی گڈھ لے جائی گئی اور پھر سر سیّد کے پہلو میں سپردِ خاک کردی گئی۔ اس جانکاہ صدمہ نے ضعیف ماں کو زندہ درگور کر دیا اور کچھ مدت کے بعد وہ بھی خالقِ حقیقی کے حضور پہنچ گئیں۔ ("یادِ ایام"۔ ہمدرد ڈائجسٹ اگست ۱۹۶۵ء)

سیّدہ نشاط النّساء بیگمؒ (بیگم حسرت موہانیؒ)

سیّدہ نشاط النّساء بیگم، سیّد الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی[1] کی اہلیہ تھیں۔ والد کا نام سید بشیر حسن موہانی (وکیل) تھا جو مولانا حسرت موہانی کے ماموں بھی تھے اور پھوپھا بھی۔ ان کی شادی مولانا حسرت موہانی سے بہ اختلافِ روایت ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء یا ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ مولانا اس زمانے میں علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ دونوں میاں بیوی ہم جد تھے اور ان کی ازدواجی زندگی تقریباً اڑتیس برسوں پر محیط ہے۔ دونوں عمر بھر ایک دوسرے پر جان چھڑکتے رہے۔ شادی کے بعد عرصہ تک ان کا قیام علی گڑھ میں رہا۔ پھر جب کاروبار کے سلسلے میں مولانا نے کانپور کو اپنا مستقر بنایا تو وہ بھی ان کے ساتھ کانپور چلی گئیں اور وہیں باقی زندگی گزاری۔

سیّدہ نشاط النّساء بیگم کو بچپن میں دینی تعلیم کے علاوہ اردو فارسی اور عربی زبانوں کی بھی معقول تعلیم دلائی گئی اور وہ ان تینوں زبانوں میں بہت اچھی استعداد

---

[1] سیّد الاحرار رئیس المتغزلین مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کا شمار برِصغیر پاک و ہند کی نہایت قدآور سیاسی اور ادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزاری۔ انگریزی سامراج سے شدید نفرت بلکہ دشمنی ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور بحیثیت سیاستدان وہ ایک نہایت بہادر، بے لوث، بے باک، حق گو اور دیانت دار رہنما تھے۔ بحیثیت ادیب و صحافی وہ ایک سلیقہ مند، محنتی اور شعر و ادب پر بہت گہری نظر رکھنے والے ایڈیٹر تھے۔ بحیثیت شاعر وہ صفِ اوّل کے غزل گو تھے اور بجا طور پر رئیس المتغزلین کے لقب کے مستحق ٹھہرائے گئے تھے۔ بطور انسان وہ اقتصادی امور میں سوشلزم کی طرف رجحان رکھنے کے باوجود بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ "بچپن سے موت تک سچے اور پکے دیندار مسلمان رہے۔ وہ نہ صرف مسلمان بلکہ صوفی مسلمان تھے اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

رکھتی تھیں۔ شادی سے پہلے وہ اپنے قصبے موہان کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد زندگی کے آخری سانس تک اپنے شعلۂ متحرک درویش صفت شوہر کا دکھ اور سکھ تنگی اور آسانی ہر حال میں نہایت خلوص اور ثابت قدمی سے ساتھ دیا۔ اور نہ صرف ان کی سیاسی جدوجہد میں بڑے جوش وخروش سے ان کی شریک کار رہیں بلکہ ان کی علمی وادبی سرگرمیوں میں بھی ہاتھ بٹاتی رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدہ نشاط النساء، بیگم مولانا حسرت موہانی کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی تھیں اور مولانا کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

تھے جن سے بزرگوں کا کوئی مزار اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس نہ چھوٹتی تھی خصوصاً رد ولی کی مجلسیں۔" (یادِ رفتگاں) سادگی اور سادہ مزاجی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ عمر بھر ملک کے بنے ہوئے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے رہے، غذا میں جو مل جاتا کھا لیتے، گھر کا سودا سلف خود بازار سے خریدتے اور اسے اپنے کندھے پر اٹھا کر لاتے۔ ہمیشہ ریل کے نچلے درجے میں سفر کرتے۔ سامان سفر ٹین کے ایک چھوٹے سے بکس اور ایک بستر پر مشتمل ہوتا۔ بکس میں لکڑی کے نہایت معمولی کنگھے، سرمہ دانی، اور چند کتابوں کے علاوہ معمولی لٹھے کے دو پاجامے اور گھٹیا قسم کی ململ کے دو کرتے ہوتے۔ بستر ایک بوسیدہ دری، ایک تکیے اور ایک بہت ہی فرسودہ کمبل پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ بستر اور بکس خود ہی اٹھاتے تھے اور کسی دوسرے کو اٹھانے کی زحمت نہ دیتے تھے۔ مولانا تسنیم مینائی (نبیرہ امیر مینائی) کا بیان ہے کہ "قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے مولانا حیدر آباد (دکن) میں تھے، ایک سہ پہر کو ہم کچھ احباب مفتی عبدالقدیر بدایونیؒ کے ہاں سے واپس ہو رہے تھے کہ مولانا سڑک پر مل گئے۔ کندھے پر آٹے کا تھیلا رکھا تھا، ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کی بوتل تھی دوسرے میں ترکاری گوشت وغیرہ کی ٹوکری، راقم الحروف نے اور دوسروں نے بہت کوشش کی، اصرار کیا کہ مولانا! کچھ سامان ہم کو دے دیجئے ہم گھر تک پہنچا دیں گے مگر مولانا کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ یہی کہا ہم اپنا سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور ہم کو بازار میں سودا سلف لے کر نکلنے میں کوئی عار نہیں۔"

(ماہنامہ "فاران" کراچی مئی ۱۹۸۹ء)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کسی سوانح نگار کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ان کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ان کی باوفا بیگم کے کردار کو نظر انداز کر جائے۔ مولانا کی وفات پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۰ھ میں اپنے جو تاثرات قلمبند کیے ان کے آخر میں لکھا کہ :

"حسرتؔ کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفادار، شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہو سکتا۔ آج سے پینتیس برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جس زمانے میں مولانا کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ تھی، مولانا الیاس برنی مرحوم نے ان کی زندگی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچا ۔ "ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں میں مولانا حسرتؔ موہانی کی زبردست شخصیت اپنے غیر معمولی خصوصیات اور جامعیت کی بدولت سب سے الگ نظر آتی ہے۔ صورت شکل لباس دیکھو تو کٹّے مُلّا۔ عربی فارسی کے علوم میں خاصے مولوی۔ انگریزی اور مغربی علوم کے نامور گریجویٹ اور علیگ، زبان اردو کے مسلّم الثبوت ادیب۔ شاعری میں مومنؔ بلکہ غالبؔ کے جانشین۔ اخلاق و عادات کی سادگی اور طبیعت کی بے نیازی دیکھو تو سچے فقیر۔ محبت دین اور جذبۂ ایمانی دیکھو تو پکّے صاحبِ دل۔ معاش کے معاملہ میں چھوٹے سے تاجر اور اپنی سیاسیات کے اعتبار سے لیڈروں کے لیڈر۔ ان کی آواز سنو تو بچوں کی سی نرم۔ بات سمجھو تو شعلہ جیسی گرم۔ عزم و ارادہ کی استقامت و استقلال میں اپنی آپ نظیر اور ملک و ملت کی خاطر آبرو لٹانے اور جان لڑانے میں سب سے پیش پیش۔ مولانا حسرتؔ کی زندگی کا کوئی دور اور کوئی پہلو بھی دیکھو، سر سے پیر تک ان کی رگ رگ میں صداقت اور خلوص بھرا ہوا ہے اور ان کی شخصیت استقامت کا پہاڑ معلوم ہوتی ہے اور یہ بات بڑوں بڑوں میں بھی کمتر نظر آتی ہے۔ مولانا حسرتؔ کی تمام زندگی اکبرؔ مرحوم کے اس شعر کی تفسیر معلوم ہوتی ہے ؎

ناز کیا اس پہ کہ بدلا ہے زمانے نے تمہیں | مرد وہ ہیں جو زمانہ کو بدل دیتے ہیں

(جذبات فطرت)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)